واہ حیدرآباد

عَابد مُعِز

واہ حیدرآباد

عابد معز

اشاعت	بار اول ۔ جنوری ۱۹۹۴ء
سرورق	شعیب ربانی
کمپوزنگ	سید علی نظامی، سدرہ گرافکس، مہدی پٹنم
طباعت	اسپیڈ پرنٹس، آفسیٹ پرنٹرس ۔ حیدرآباد
قیمت	ساٹھ روپے
ناشر	زندہ دلان حیدرآباد، مجرد گاہ، حیدرآباد
مصنف کا پتہ	پوسٹ باکس ۵۲۵۳، ریاض ۔ ۱۱۴۲۲، سعودی عرب

ملنے کے پتے:

* ماہنامہ شگوفہ، ۳۱، بیچلرس کوارٹرس، حیدرآباد ۱۳ ۔ فون ۵۵۷۷۱۶
* حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد ۔ ۲
* مکتبہ جامعہ، پرنسس بلڈنگ ۔ بمبئی ۔ ۳

TITLE	: WAH HYDERABAD
AUTHOR	: ABID MOIZ
SUBJECT	: URDU ESSAY - HUMOUR
YEAR	: JANUARY 1994
PRICE	: Rs. 60 /-
PUBLISHER	: ZINDA DILAN - E - HYD. BACHELORS QUARTERS, HYDERBAD-1, INDIA.

ترتیب

پیاری بیٹیوں

مہ ناز، مہ جبین، مہ طلعت اور ان کے چاچو

سید خواجہ رضی الدین

کے نام

جن کی مسکراہٹیں

میرے لئے سرمایۂ حیات ہیں

مِرا شہر لوگاں سوں معمُور کر
رکھیا جوں تو دریا میں مِن یا سمیع

مقدمہ

حیدرآباد ایک شہر ہی نہیں ایک تہذیب کا بھی نام ہے ۔ اس کے بسانے والے نے محبت کے ایسے خزانے لٹائے کہ اس سرزمین سے جو بھی اٹھا، ان خزانوں سے فیضیاب اور اس کی تہذیب کے عشق میں مبتلا نظر آیا ۔ اکثر ادیبوں اور شاعروں نے، جن میں خاصی تعداد بیرون حیدرآباد سے تعلق رکھتی ہے، اپنی شعری و نثری تخلیقات میں اس شہر سے عشق کی حد تک لگاؤ کا اظہار کیا ہے ۔ حیدرآباد پر اس کی ۴۰۰ سالہ زندگی میں بے شمار مضامین لکھے جا چکے ہیں ۔ حیدرآباد کی تاریخ، اس کا محل وقوع، ماحول، موسم، عمارتیں، تہذیب و تمدن، آبادی اور اس کے مسائل ۔۔۔ اس طرح کے مختلف النوع موضوعات پر مختلف زبانوں میں لکھا جاتا رہا ہے ۔ مزاح نگاروں کا بھی یہ مرغوب موضوع رہا ہے لیکن حیدرآباد کی تہذیبی، سماجی اور سیاسی زندگی پر اتنے ڈھیر سارے مضامین عابد معز کے علاوہ کسی مزاح نگار نے نہیں لکھے ۔ دراصل یہ سارے مضامین انھوں نے ماہنامہ شگوفہ کے لئے لکھے تھے اور بالالتزام تقریباً چار سال تک ہر مہینہ حیدرآباد سے متعلق کسی نہ کسی موضوع پر شگوفہ میں چھپتے رہے ہیں ۔ ان میں سے بعض موقتی اور مقامی نوعیت کے مضامین ہیں ۔ اسکے باوجود ہر دور اور ہر علاقہ میں دلچسپی سے پڑھے جائیں گے ۔ مشمولہ مضامین کی فہرست سے اندازہ ہوگا کہ عابد معز نے حیدرآباد کی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے

اور ایک نکتہ سنج و نکتہ داں مزاح نگار کی آنکھ نے جو کچھ دیکھا، اس کے قلم گوہر بار نے اسے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ شہری زندگی کی وہ جزئیات اور پہلو جن کا عوامی نظم و نسق، سیاسیات اور سماجیات کی کتابوں میں تفصیلی ذکر ممکن نہیں اور مورخین کی سنجیدہ نگارشات کے لئے جو شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کا ہنسی ہنسی میں عابد معز نے احاطہ کیا ہے۔ جس مقام پر پہنچ کر سنجیدہ نگار چپ سادھ لیتا ہے، اس سلسلہ کو مزاح نگار عابد معز نے بڑے شگفتہ انداز میں دراز کیا اور شہری زندگی کے پیچ و خم کی بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ عکس کشی کی ہے۔

ان مضامین کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ عابد معز نے حزب مخالف کے روایتی قائد کا سا کردار انجام دیا، جو ہر معاملہ کے منفی یا تاریک گوشوں کو اجاگر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ ان کے مضامین کے مطالعہ سے ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں ایک ایسے شہر حیدرآباد کی تصویر ابھرتی ہو جہاں سانس لینا بھی دشوار ہے اور جہاں زندگی گذارنا ایک معرکہ سے کم نہیں لیکن جس طرح اپوزیشن کا وجود جمہوریت کی بقاء کے لئے ضروری ہے اسی طرح ان مضامین میں اختیار کردہ عابد معز کا طرز نگارش حیدرآباد سے متعلق مثبت پہلوؤں، روایتوں اور اقدار کو مستحکم کرنے کا بالواسطہ کام انجام دیتا ہے۔ ادب میں مزاح نگار کا رول بھی یہی ہے کہ وہ ہر قسم کی کجی، بے ہنگم کیفیت، انتشار اور بوالعجبیوں کو اپنی تحریر کا ہدف بناتا ہے۔ یہ دراصل "بے مہر" کہہ کر طعن و تشنیع کے ذریعہ کام نکال لینے اور اپنی محبت کی مہر ثبت کرنے کا پیچیدہ عمل ہے جس سے عابد معز کامیاب گزرے ہیں۔ حیدرآباد ان کے لئے بت ہزار شیوہ ہے، جس کی ہر ادا انھیں بے حد عزیز ہے۔ اس بت کو چاہنے، پوجنے اور زندگی کے چند لمحے اس کے ساتھ پر سکون انداز میں گذارنے کے لئے جو ماحول درکار ہے اس کی عدم دستیابی پر معز احتجاج کرتے نظر آتے ہیں اور یہ احتجاج گو کہ معز نے روشنائی سے قلمبند کیا ہے لیکن اس میں خون جگر کی کار فرمائی بھی نظر آتی ہے۔ کیونکہ ان کے جسم کا ہر قطرہ شہر حیدرآباد کا پروردہ اور مرہون منت ہے۔ عابد معز کا احتجاجی اور طنزیہ لب و لہجہ شہر سے ان کے تعلق خاطر کا مظہر ہے۔

عابد معز کے ان مضامین کو اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ یہ صرف حیدرآباد کی کہانی نہیں بلکہ ہر ترقی پذیر طویل تاریخ اور درخشاں ماضی کے حامل مہذب شہر کی صورت حال ہے۔ حیدرآباد تو محض ایک علامت ہے۔ ہندوستان میں ہی نہیں دنیا کا ہر بڑا شہر آبادی کے اضافہ کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کے مدنی مسائل میں گرفتار ہے۔ ملکوں کے حالات کے لحاظ سے مسائل کی نوعیت جداگانہ ہو سکتی ہے۔ ہر شہر میں نئے تقاضوں نے پرانی اقدار کے نشان زیر و زبر کر دئے ہیں۔ شہروں کے جنگل میں بسنے والا انسان اپنی اقدار و روایات کا کب تک پاسباں بنا رہے گا؟ جنگلی پن اس پر سایہ فگن ہے اور "گن کلچر" نے اسے تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔۔!

جس دور میں معز نے یہ مضامین لکھے تھے اس وقت حیدرآباد مسلسل فسادات کی لپیٹ میں تھا۔ فسادات، کرفیو اور اس طرح کے حالات کا جو کرب، معز کے مضامین میں نظر آتا ہے، وہ یقیناً صرف حیدرآباد کی قسمت نہیں بلکہ ہر ستم رسیدہ و فساد زدہ شہر کا ترجمان ہے۔

عابد معز پچھلے دس سال سے لکھ رہے ہیں - پیشہ طب سے وابستہ ہیں اور نبض پر ہاتھ رکھ کے مرض پہچاننے کا فن خوب جانتے ہیں - ان کا مشاہدہ تیز ہے - ان کی عام تحریروں کے موضوعات میں تنوع بھی ہے - زیر نظر مضامین ان کے ادبی نگار خانے کا محض ایک گوشہ ہیں - ان کے مضامین کے مطالعہ سے عابد معز کی ادبی صلاحیتوں کا اندازہ ضرور ہوتا ہے لیکن ان کے ذریعہ قطعی محاکمہ ممکن نہیں - پچھلے ایک دہے میں لکھے گئے ان کے مزاحیہ مضامین بھی کتابی صورت میں شائع ہونے چاہئیں -

حیدرآباد کے موضوع پر لکھے گئے ان دلچسپ مضامین کی اشاعت پر میں عابد معز کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں - مجھے یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کو سراہا جائے گا -

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
مدیر شگوفہ

۲۰ - جنوری ۱۹۹۴ء
حیدرآباد

شہر میں گھومتا ہوا آئینہ

عابد معز عجیب انسان ہیں ۔ آپ ان سے ملیں گے تو انہیں خاموش طبع پائیں گے ۔ ان کی کم گوئی سے آپ ایسے ہی چڑیں گے جیسے عام طور پر لوگ کسی باتونی کی خرافات سے چڑتے ہیں ۔ آپ عاجز بھی آئیں گے تو ان کی اس عادت سے کہ جہاں دوسرے احباب کسی بات پر ہنستے ہوئے محفل کو قہقہہ زار بنادیتے ہیں وہاں عابد معز لبوں کو ہلکا سا خم دے کر ایک پھیکی سی مسکان کا ہلکا سا اشارہ دینے پر اکتفا کرتے ہیں ۔ آپ ناراض بھی ہوں گے تو اس وجہ سے کہ وہ کسی سے ناراض نہیں ہوتے ۔ گرم جوشی اور چرب زبانی، پر گوئی اور زود سخنی، کلاہ و دستار سے بے نیاز سرکشی اور جیب و گریباں سے ماورا، چاک دامنی عام الناس کو تو زیب دیتی ہے ۔ خاص لوگوں کو نہیں ۔ اس دور کم ہنراں میں ہنرمندی کے اظہار کی بہتر ترکیب یہ ہے کہ اس کا کم سے کم اظہار ہو لبوں کو ہلکا سا خم دینے کی جرات عابد معز کے ہاں جرات رندانہ ہے، پھیکی سی مسکان کا مطلب بلند آہنگ ہنسی کا اعلان ہے ۔ ہلکے سے اشارے کا مقصد واضح اور بلند بانگ دہل ہے ۔ یعنی کم سخنی میں پر گوئی ہے اور بظاہر سرد مہری میں بہ باطن گرم جوشی ہے ۔

تو کیا وہ حیدرآباد کا چلتا پھرتا اشتہار ہیں؟ کیا حیدرآبادی اس قبیل سے ہیں جس کے فرد بولتے، چہکتے اور ہنستے کم ہیں ۔ جی نہیں، حیدرآباد کی زمین کی پیداوار ہوتے ہوئے بھی عابد معز نے شاید اپنے اندر کے حیدرآبادی کو جو بولتا ہے، چہکتا ہے، ہنستا ہے، پابجولاں باندھ کر رکھا ہوا ہے ۔ اس لئے جب تک آپ انہیں حیدرآباد کے مخصوص لہجے میں دیگر ساکنان کوچہ دلدار یعنی حیدرآبادی لوگاں سوں بات کرتے ہوئے نہ سن لیں، آپ انہیں آندھرا کے کسی اور حصے کا سمجھ کر معاف کردیں گے ۔ شاید کم گوئی اور "بول بچن کی ماندگی" انہیں اپنے طبیب ہونے کے ڈسپلن سے ملی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ وکیل بولتے زیادہ ہیں ۔ جج صاحبان سنتے زیادہ ہیں اور اطباء نہ سنتے ہیں نہ بولتے ہیں ۔ فقط چیر پھاڑ کرتے ہیں ۔ عابد معز صاحب البتہ اپنے نشتر قلم کو اکثر و بیشتر میان کے اندر رکھتے ہیں تاوقتیکہ خوجی کی طرح اس قرولی کو بھونکنے کی ضرورت صرف

حیدر آباد کے حوالے سے نہ پڑے اور اس چیرپھاڑ سے شہر کے فاسد مواد کو خارج کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

سروانتس کے شہرآفاق ناول "ڈان قویہاتے" "Don Quixote" کو ملک میں گھومتا ہوا آئینہ اس لئے قرار دیا گیا کہ اس rogue novel کا ہیرو ایک ایسا چلتا پھرتا آئینہ ہے جو سارے اسپین کی اس زمانے کی زندگی کو جو سڑک کے دونوں کناروں پر بکھری ہوئی ہے ریکارڈ کرتا چلا جاتا ہے۔ کبھی بجنسہ، جیسے عام ڈریسنگ ٹیبل کا آئینہ ایک ایماندار فوٹو گرافر کی طرح کرتا ہے۔ کبھی گھٹا بڑھا کر، توڑ مروڑ کر، جیسے مقعر اور محدب آئینے ہی کر سکتے ہیں اور کبھی دھندلایا سا، مٹ میلا اور گدلے پانی کا سا عکس دکھا کر، جیسے کوئی تن کا میلا لیکن من کا اجلا آئینہ ہی کر سکتا ہے۔ بہر حال آئینہ تو آئینہ ہے۔ فرق تو اس آب کا ہے جو آئینے کو مشاق آئینہ ساز نے دی ہے۔

سروانتس ملک گیر macro level آئینہ ساز تھا جس نے پورے ہسپانیہ کو کبھی اپنی سیدھی سادی اور کبھی اپنی بھینگی، ٹیڑھی نظر سے دیکھا اور دنیا کو دکھلایا۔ عابد معز micro لیول کے بلدیاتی آئینہ ساز ہیں جن کا چلتا پھرتا آئینہ صرف حیدر آباد کو ہی دیکھتا ہے۔ خوبصورتی اس آئینے کی یہ ہے کہ lens بدلتا چلا جاتا ہے اور قاری کو یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کھلواڑ ہو رہی ہے۔ دن دہاڑے اس کی عقل سلیم پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔ اسے اندھوں کی طرح لاٹھی کے سہارے شہر کے اوبڑ کھابڑ، اونچے نیچے، ہموار ناہموار راستوں پر چلایا جا رہا ہے۔ آئینے کا آڈیو یعنی رننگ کامنٹری دینے والا گائیڈ آہستہ روی سے، دھیمے لہجے میں پھسپھساتے ہوئے، اس کے کان سے اپنے ہونٹ جوڑے ہوئے، زیر لب اسے بتاتا جاتا ہے کہ سلطان قلی قطب شاہ کون شخص تھا۔ بھاگ متی کا عشق کیا رنگ لایا جس کی سزا آج تک موسیٰ ندی کے کنارے بسایا ہوا یہ شہر بھگت رہا ہے۔ اس کا حدود اربعہ کیا ہے۔ حدود اور اربعہ سے بعید اس کی تاریخ کیا ہے اور یہ تاریخ کیسے بنتی، مٹتی، بن بن کر مٹتی اور مٹ مٹ کر بنتی رہی ہے۔ چارمینار کب وجود میں آیا اور اب تک کیوں کھڑا ہے۔ مچھر اور افواہوں میں کیا تفاوت ہے۔ دونوں بڑھتے، پھیلتے، اڑتے اور کاٹتے کیوں ہیں۔ سڑکوں اور فٹ پاتھوں کا جو چولی دامن کا ساتھ ہے، کہاں ٹوٹتا ہے اور پھر ٹوٹ کر کہاں استوار ہوتا ہے۔ بارش اور قیامت جب نہیں آتیں تو نہیں آتیں، لیکن جب آتی ہیں تو اکٹھی کیوں چلی آتی ہیں۔ حیدر آباد جو کہ ایک خطہ ہے، کیسے ایک تہذیب بنی اور پھر یہ تہذیب کیسے عرب اور خلیج کے چھوٹے چھوٹے لیکن روپے پیسے میں ازحد موٹے ملکوں کو برآمد ہوئی۔ شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں میونسپلٹی کے نل کھانس کھانس کر بے دم ہوتے ہوئے کیوں چلتے ہیں اور قلت آب جب آفت جان بنتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔ زبانوں، بدزبانوں اور بے زبانوں کا یہ شہر کب اہل زبان کی زد میں آیا جو شمال مشرق سے اس کی سرحد میں در آئے، اور جب اس تہذیب میں دبے پاؤں گھسے تو اسی تہذیب کے ہو رہے۔ انتخابات کا موسم کن گھنگھور بادلوں سے گھر کر آتا ہے۔ اور جب سب انتخابات ہو چکتے ہیں تو فساد اور فسادی کیسے جنم لیتے ہیں۔ فرقہ وارانہ یگانگت اور رواداری کا یہ شہر کیسے بلوائیوں کے ہاتھوں بیچ دیا جاتا ہے۔ کرفیو کا نفاذ کیسے حیدر آباد کو

کرفیو آباد بنا کر بھری بستیوں کو غیر آباد کر دیتا ہے۔ جارج آرویل کی The Animal Farm سے مستعار ادبی استعارے میں انسانوں کے بارے میں جانوروں کی کانفرنس کیا کیا فیصلے صادر کرتی ہے۔

تو صاحبو! جب آپ شہر میں گھومتے آئینے کے ساتھ چلتے ہوئے حیدر آباد دیکھ لیں۔ اس کی آوازیں سن لیں۔ اس کی خوشبوئیں سونگھ لیں۔ اس کے حریری یا پتھریلے لمس کو پالیں۔ یعنی "واہ حیدر آباد" ختم کرلیں تو دل پر ہاتھ رکھ کر خود سے یہ پوچھیے کہ کیا آپ حیدر آباد کے بارے میں سب کچھ جان گئے؟ جواب یقیناً اثبات میں ملے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی قسم کی اس واحد کتاب میں جو ایک ہی شہر کا اعلانیہ بھی ہے۔ طربیہ بھی اور حزنیہ بھی۔ شاید آپ کو "واہ حیدر آباد" کے پیچھے ہلکی سی "آہ حیدر آباد" بھی سنائی دے۔ رونے بسورنے سے ہنسنا یقیناً بہتر ہے۔ چاہے اس ہنسی کی آڑ میں دل کا خون ہی کیوں نہ ہو رہا ہو۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

یکم جنوری۔ ۱۹۹۴ء
ریاض، سعودی عرب

پیش لفظ

دوسروں پر چوٹ کرنے کے بجائے اپنے آپ کو تختۂ مشق بنانا اوروں کو پسند آتا ہے۔ یہ ہے تو مشکل کام لیکن یہی کامیاب مزاح نگاری ہے۔ ہماری اس رائے سے انگریزی زبان کے نامور مزاح نگار مارک ٹوین بھی متفق تھے۔ انھوں نے کہا تھا "بڑا مزاح نگار وہ ہے جو دوسروں پر کیچڑ اچھالنے کے بجائے خود اپنا مذاق اڑانے کا حوصلہ رکھتا ہو"۔ اس عمل میں احتیاط کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ خود کا مذاق اڑانے میں دوسروں کی خفگی، ناراضگی اور غصہ کا احتمال نہیں رہتا۔

انسانی فطرت ذاتی کمزوریوں کی پردہ پوشی کو فوقیت دیتی ہے۔ نظریں اونچ نیچ کی تلاش میں دوسروں کا محاسبہ کرتی رہتی ہیں۔ لطف بھی آتا ہے۔ ہم نے اپنا اور اپنے ماحول کا تنقیدی جائزہ لینے کو فوقیت دی۔ خود پر نشتر لگائے آس پاس کے ماحول کو نشانہ پر رکھا۔ اک تسکین کا احساس ہوا کہ دوسروں سے قبل ہم نے خود اپنی کمزوریوں کو ہدف ملامت بنایا۔ اپنی شبیہہ ٹانگ کر اس پر تیر چلاتے رہے اور جب طبعیت چاہی خود کو گدگدا کر خوش ہو لئے۔

اس تمہید کا مقصد واضح ہو چکا ہو گا۔ ہم نے لن ترانی اس توقع پر کی ہے کہ وطن مالوف حیدرآباد پر مضامین لکھنے اور انھیں کتابی شکل میں پیش کرنے کا جواز پیدا کیا جائے۔ "واہ حیدرآباد" میں شامل مضامین ماہنامہ شگوفہ میں "مرا شہر لوگاں سوں معمور کر" عنوان کے تحت شائع ہو چکے ہیں۔ اس سلسلہ کا پہلا مضمون جون ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا اور آخری مضمون مارچ ۱۹۸۷ء میں چھپا۔ یہ مضامین شہر حیدرآباد سے تعلق مختلف موضوعات پر مبنی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ایک ہی بات مختلف پیرائے میں کہی گئی ہو اور کبھی یکسانیت کا احساس بھی ہو۔ یہ مجبوری شاید موضوعاتی مضامین کا لازمہ ہے اس طرح کے موضوعات میں ادبی شہ پارے تخلیق کرنے کی گنجائش کم ہوتی ہے جس کے لئے ہم اپنے آپ کو اہل نہیں پاتے۔

مضامین پڑھ کر یہ احساس بھی ابھر سکتا ہے کہ ہم نے صرف شہر حیدرآباد کے منفی پہلوؤں کو تلاش کیا ہے اور خوبیوں کو نظرانداز کر دیا ہے ۔ ہمارے شہر کی خوبصورتی اور اس کی خوبیوں کو پسندیدگی کی سند کئی دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے عطا کی ہے ۔ ہم نے اپنی راہ الگ نکالی ۔

حیدرآباد پر لکھے گئے مضامین کو کتابی شکل دینے کا دو مرتبہ (۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۱ء میں) ارادہ ہوا لیکن کچھ ذاتی اور کچھ شگوفہ کی مصروفیات کے سبب یہ کوششیں ثمرآور نہ ہو سکیں ۔ کتاب شائع ہونے کا مناسب وقت شہر حیدرآباد کی چار سو سالہ تقاریب کا موقع تھا لیکن ہمارے خیال میں اب بھی اتنی دیر نہیں ہوئی ہے ۔ اب یہ مضامین کتابی شکل میں آپ کے سامنے ہیں ۔ ہم اپنی بات کہنے میں کہاں تک کامیاب ہیں اس کا فیصلہ تو قارئین کرام ہی کر سکتے ہیں ۔ دلچسپی اور شوق سے پڑھنے والے قاری ہی اصل نقاد ہیں اور ان ہی سے کتابوں کی دنیا میں زندگی اور رنگ ہے ۔

ہم ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال مدیر شگوفہ کے سپاس گذار ہیں کہ انہوں نے اپنے رسالہ میں حیدرآباد پر لکھے گئے ان مضامین کی اشاعت کا سلسلہ کیا شروع اور اب کتابی شکل دے کر اسے ختم کیا ۔ مقدمہ لکھ کر ہماری وکالت کی ۔ مزید کرم فرمایا ۔ پروفیسر ستیہ پال آنند کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے قلیل مدت میں مسودہ پڑھ کر تعارف لکھا ۔ عزیز دوست جناب محمد شجاع الدین غوری اور جناب مضطر مجاز کے تعاون کا اعتراف بھی ضروری ہے ۔ جناب شعیب ربانی کے بھی ممنون ہیں کہ انہوں نے کتاب کو سرورق کے کوزے میں سمیٹ لیا ۔ بہ عجلت ممکنہ کمپوزنگ اور طباعت کے لئے جناب حافظ محمد نورالدین سلیم، جناب علی احمدی، جناب رفعت سلیم اور جناب اعجاز حسین نے ہماری مدد کی جس کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں ان احباب کا ذکر یہاں ممکن نہیں جو وقتاً فوقتاً ان مضامین کی یکجا اشاعت کے لئے مشوروں سے نوازتے رہے ہیں ۔

آخر میں ہمیں اپنی بیگم کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے ۔ بات گھر کی سہی لیکن یہ ہماری ازدواجی ذمہ داری ہے ۔ بیگم کا اس لئے بھی شکریہ کہ انھوں نے ہمیں وقت مہیا کیا اور کتاب شائع کرنے کی اجازت بہ رضا و رغبت دی ۔

عابد معز

۲۵۔ جنوری ۱۹۹۴ء

حیدرآباد

واہ حیدر آباد

تاریخی روایت ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ متی کے عشق میں شہر حیدر آباد بسایا۔ "لوگاں کو پانی ہونا پڑتا بول کو" موسیٰ ندی کے کنارے کا انتخاب کیا۔ محمد قلی قطب شاہ اردو کا صاحب دیوان شاعر بھی تھا، اس نے ندی کی مناسبت سے دعا کے لئے یہ شعر موزوں کیا

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں تو دریا میں من یا سمیع

اللہ محمد قلی قطب شاہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اس کی دعا قبول ہوئی۔ محمد قلی قطب شاہ کے دریا میں اتنی مچھلیاں ہوئیں کہ شہر حیدر آباد پھیلتا گیا۔ موسیٰ ندی کو بھی اپنے دامن میں لے لیا۔ بے چاری حیران و پریشان سکڑ سی گئی ہے۔ اب تو اس ندی کا پانی، دھوبیوں کو کپڑے دھونے کے لئے بھی کم پڑتا ہے۔

کہنے کے لئے حیدر آباد کے حدود اربعہ ہیں لیکن حیدر آباد شہر جغرافیائی حد بندیوں کو بالائے طاق رکھ کر خوشبو کی طرح پھیلتا گیا۔ ہم چلتے چلتے تھک جائیں گے لیکن حیدر آباد ختم نہ ہوگا۔ آس پاس کے علاقے والے اپنے آپ کو حیدر آباد کے شہری کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی، حیدر آباد شہر اب ساری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ شکاگو میں حیدر آباد ملے گا۔ بقول مجتبیٰ حسین کوئی بھی پتھر اٹھائیے اس کے نیچے سے حیدر آبادی آداب عرض کرتے ہوئے برآمد ہوگا۔ ٹورنٹو میں چنبیلی کا منڈوا پڑا ہے تو لندن میں کوہ نور موجود ہے۔ خلیج کی فضاؤں میں "ہو" اور "نکو" کی آوازیں گونجتی ہیں۔ ہمارے ایک غیر حیدر آبادی دوست کہتے ہیں "میں کہیں جاؤں حیدر آبادی اور مچھر پیچھا نہیں چھوڑتے، یہ دونوں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ ہم نے حیدر آبادی اور مچھر میں مناسبت کا سبب دریافت کیا تو فرمایا" دونوں ہی اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں۔" ہمارا ایقان ہے کہ حیدر آباد شہر ایک جغرافیائی خطہ نہیں ہے بلکہ حیدر آباد ایک تہذیب کا نام ہے جو

دکن سے ابھر کر کرہ ارض پر پھیل گئی۔ یہ تو محمد قلی قطب شاہ کی دور اندیشی تھی جس نے شہر بسانے سے قبل چار مینار بنوایا۔ حیدرآباد شہر کا یہ نشان امتیاز چار سو سال بعد بھی اپنے چاروں مینار سمیت موجود ہے۔ چار مینار، شہر حیدرآباد کی بازیافت میں مورخین کی مدد کرتا ہے۔

حیدرآباد جو بھی آیا، اس شہر وفا نے اس کا استقبال کیا۔ خیر مقدم کیا۔ بقول رائے محبوب نارائن "دلی لٹی تو مامن امن حیدرآباد، شام اودھ ڈھلی تو حیدرآبادی نے شب نغمہ سنواری، صبح بنارس چھپ ہو گئی تو حیدرآبادی نے بھگتی کے بھجن گائے۔" مختلف مقامات سے لوگ حیدرآباد آئے یا بصد اصرار بلائے گئے۔ یہاں سکونت کو پر سکون جانا، ان میں چھپے جوہروں کو حیدرآباد نے پہچانا، انہیں تراشا اور وہ یہیں کے ہو رہے۔ ہم حیدرآبادی، آنے والوں کی قدر کرتے، ناز برداریاں کرتے، انہیں نوازتے اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، یہی وجہ ہے کہ ہمارے شہر میں مدراسی ہوٹلیں اور ایرانی چائے مشہور ہے۔ بقول شاعر

جب چائے پیتے ہیں ہم ایرانی ‏ ‏ تو ہوتی ہے دور ہماری پریشانی

تجارت میں گجراتی، سندھی اور مارواڑیوں کی اجارہ داری ہے۔ سرکاری نوکریوں میں آندھرا والوں کی بھرمار ہے۔ ادب میں شمالی ہند کے لوگ اپنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔

دوسرے مقام کا کوئی بھی انسان، انسانیت کے اس شہر میں اپنے آپ کو پردیسی محسوس نہیں کرتا۔ یہ ہمارا دعویٰ ہے کہ حیدرآباد کی گلیوں میں کوئی پردیسی نکل جائے تو اس کے ہم رنگ، ہم نسل اور ہم زبان لوگ مل جاتے ہیں اور وہ سب مل کر اپنی اپنی کالونی آباد کر لیتے ہیں۔ ہمارے شہر میں ہر مقام کی کالونی ملے گی۔ آندھرا کالونی، ایرانی گلی، حبشی گوڑہ، سندھی کالونی، عرب گلی وغیرہ۔ ہمارا شہر اس حد تک کاسموپولیٹن بن گیا ہے کہ آج خود حیدرآبادی تلاش گمشدہ کا اشتہار بن چکا ہے۔ جب بھی ہمیں حیدرآباد اور اس کے شہری کی یاد ستاتی ہے تو ہم حیدرآباد اور حیدرآبادی کو ڈھونڈنے نکلتے اور ناکام لوٹتے ہیں۔ چند دن قبل ہم حیدرآبادی کو تلاش کرنے کی مہم پر تھے کہ ایک حیدرآبادی نظر آیا۔ چوڑی دار اور نہ شلوار قسم کا کچھ ڈھیلا اور کچھ تنگ پاجامہ، شیروانی کے تمام بٹن بند اور سر پر لانبی پھندنے والی ٹوپی پہنے، فرشی آداب عرض کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہم بہت خوش ہوئے۔ احتراماً اس کے ہاتھوں کو چوما۔ وہ پریشان ہوا اور کہنے لگا۔ "میں حیدرآبادی نہیں ہوں۔ رشید قریشی کے ڈرامہ "محبوب" میں اداکاری کر رہا ہوں۔"

جس طرح حیدرآباد شہر نے ہر نسل اور ہر مقام کے انسانوں کو گلے لگایا ویسے ہی حیدرآباد کی گود میں مختلف زبانیں پروان چڑھیں۔ شمال سے فارسی اور اردو زبانیں حیدرآباد آئیں۔ اردو ذریعہ تعلیم اور پھر سرکاری زبان بنی۔ شہر میں اردو کی پہلی جامعہ قائم ہوئی۔ جب اردو ترقی پا چکی تو شہر حیدرآباد نے اردو کو چھوڑ کر تیلگو کی سرپرستی شروع کی جو اب بھی جاری و ساری ہے۔ ان دو زبانوں کے علاوہ ہمارے شہر میں دوسری زبانیں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ہم تو کہیں گے کہ ہمارے شہر میں بیک وقت کئی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔

حیدرآباد کے موسم کے بارے میں ہم کہیں گے کہ یہاں کا موسم یکساں اور قابل بھروسہ ہوتا ہے ایک ہی قسم کے کپڑوں میں سال بھر گذارا جاسکتا ہے۔ ہر اچھے شہر کے موسم کی طرح ہمارے شہر میں بھی تین رتیں ہوتی ہیں۔ گرما، بارش اور سرما۔ گرمی ہوتی ہے لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ کشمیر یا اوٹی جانے کے لئے مجبور کردے اور نہ ہی اتنی کہ حسینوں کو اپنا رنگ ماند پڑجانے کا خدشہ لگا رہے۔ بارش وقفے وقفے سے ہوتی ہے۔ شہریوں کو بھیگ کر سوکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ برساتی اور چھاتہ استعمال کرنے کی شاذ و نادر ہی ضرورت پیش آتی ہے۔ باقی رہا موسم سرما، وہ بھی پریشان نہیں کرتا، گرم کپڑوں کی ایک یا دو مرتبہ ہی ضرورت پیش آتی ہے۔ شادی کی شیروانی یا واجدہ تبسم کے افسانوں سے کام چل جاتا ہے۔ حسرت دل ہی میں رہ جاتی ہے کہ موسم سرما میں اپنے آپ کو رضائی، بلانکٹ، سوئٹر، کوٹ، مفلر یا کم از کم مسیح انجم کے "بھنتہ" میں لپیٹے گرم اور چٹ پٹے کھانوں کے ساتھ یوسف ناظم کے مضامین کا لطف اٹھائیں۔

حیدرآباد شہر کی پیداوار کے تعلق سے شاہد صدیقی لکھتے ہیں۔ "اس کے کھیتوں میں جوار پیدا ہوتی ہے جسے کھا کھا کر لوگ موٹے ہوجاتے ہیں۔" وقت کے ساتھ یہ تبدیلی آئی ہے کہ ہمارے شہر میں جوار کھانا ایک عیب سمجھا جاتا ہے اور یہ بھی کہ جوار کی روٹی بنانا، پتھر کے زمانے کا فن ہے۔ جوار اور جوار کی روٹی کھانے والے پھر بھی مل جاتے ہیں لیکن جوار کی روٹی بنانے والی نہیں ملتی۔ جوار کی روٹی بنانے کے لیے، نزاکت، دانائی اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی ہاتھ اور کبھی پتھر پر تھپک تھپک کر آٹے کو گول شکل دینا اور پانی لگا کر سینکنا پڑتا ہے۔ ہمارے خیال میں جسے جوار کی روٹی بنانا آتا ہو وہ ایک مثالی بیوی ثابت ہوتی ہے۔ شاہد صدیقی ہمیں یہ بھی بتلاتے ہیں کہ حیدرآباد کے جنگلوں میں سیتاپھل دستیاب ہوتا ہے جس میں وٹامن پائے جاتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے۔ AN APPLE A DAY KEEPS THE DOCTOR AWAY کی طرح حیدرآبادیوں کے لئے روز ایک سیتاپھل صحت قائم رکھنے کے لئے کافی ہوگا۔ سائنٹسٹ مزاح نگار برہان حسین سے گذارش ہیکہ وہ سیتاپھل کی اس خوبی پر تحقیق کریں

شاہد صدیقی یہ بھی لکھتے ہیں کہ حیدرآباد کی زمین پر گھاس اگتی ہے جسے گھوڑے اور دوسرے چوپائے رغبت سے کھاتے ہیں۔ اب آپ سے کیا چھپائیں ہم نے بعض دو پایوں کو بھی گھاس چرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کے خیال میں گھاس کھانے سے بینائی اچھی رہتی ہے۔ آج تک کوئی جانور عینک استعمال کرتا نظر نہیں آیا۔

شاہد صدیقی مزید لکھتے ہیں کہ حیدرآباد کے بعض علاقوں میں نیشکر کے کھیت ہیں جس کی وجہ سے شکر سازی کی صنعت روز افزوں ترقی پر ہے اور ہم میٹھی چائے پیتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارا مشاہدہ ہے کہ ہم شکر اکسپورٹ کرتے اور شکرین استعمال کرتے ہیں۔

حیدرآباد شہر کی سب سے اہم پیداوار مچھر ہے۔ معلوم نہیں کس اندیشے کے تحت شاہد صدیقی نے مچھروں کا ذکر نہیں کیا۔ ملیریا کے جراثیم پہلی مرتبہ ایک حیدرآبادی کے خون میں دریافت ہوئے۔ یہی

جراثیم مچھر میں بھی پائے جاتے ہیں بلکہ مچھری انسانوں کو کاٹ کر ملیریا کی سزا دیتا ہے ۔ اس لحاظ سے مچھروں سے ہمارا خونی رشتہ ہے ۔ اس رشتہ کو قائم رکھنے کے لئے ہم اپنے شہر میں مچھروں کی افزائش کرتے ہیں ۔ انہیں اپنا خون پلاکر پالتے ہیں ۔ مچھروں کی پرورش اور نگہداشت کے لئے شہر میں ایک خاص محکمہ مقرر ہے ۔

حیدرآباد میں املی کے درخت زیادہ تعداد میں لگتے ہیں جس کی وجہ سے حیدرآبادی دانت کھٹے ہونے کی حد تک کھٹا کھاتے ہیں ۔ املی تو املی ہے پتوں کی کھٹاس کو تک نہیں چھوڑتے ۔ املی کے پتوں کو " چگر " کے نام سے کھاتے ہیں ۔ حیدرآباد کے ہر اچھے پکوان میں کھٹا ملا ہوتا ہے ۔ ہمارے دشمنوں کے مطابق ہماری رگوں میں کھٹا دوڑتا ہے اور ہم ایک دوسرے کی کاٹ میں رہتے ہیں ۔

حیدرآباد شہر کی تین چیزیں مشہور ہیں ۔ شیروانی ، بریانی اور گنڈی پیٹ کا پانی ۔ بعض حیدرآبادی اس فہرست میں پریشانی کو بھی شامل کرلیتے ہیں ۔ مہنگائی کی پریشانی ، قلت آب کی پریشانی ، کرفیو کی پریشانی ، فسادات کی پریشانی وغیرہ ۔ زینت ساجدہ لکھتی ہیں ۔ " حیدرآباد کی شیروانی خالی خالی نظر آتی ہے ۔ بریانی پکانے والے نہیں کہ اب کھانے والے کہاں رہے ۔ ہاں اب یہاں کی یہی ایک چیز ہے گنڈی پیٹ کا پانی ۔۔۔۔۔۔ "

شیروانی خالی نظر آنے کے ساتھ ہمیں لگتا ہے کہ حیدرآباد شہر ، شیروانی پہننے والوں سے خالی ہوچکا ہے ۔ مخدوم محی الدین نے شیروانی کے تعلق سے کہا تھا کہ اس لباس میں سب کا لباس بن جانے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے ۔ شاید ہماری شیروانی مختلف لباس جیسے پتلون ، کوٹ ، سفاری ، جودھپوری وغیرہ میں ڈھل گئی ہو ۔ شیروانی سینے والے چند " مال غنیمت لوگ " باقی ہیں ۔ لوگ دور دراز سے شیروانی سلوانے ہمارے شہر آتے ہیں ۔

بریانی اور گنڈی پیٹ کا پانی صرف اور صرف حیدرآبادیوں کو پسند آتا ہے ۔ جسے یہ دونوں چیزیں راس آئیں ، سمجھئے کہ وہ حیدرآبادی ہے ۔ بریانی اور گنڈی پیٹ کا پانی لازم و ملزوم ہیں ۔ روایت ہے کہ ایک حیدرآبادی نواب زادے نے دیار غیر میں بریانی کی دعوت کی ۔ حیدرآباد سے باورچی بلایا گیا ، برتن ، مسالے اور دوسرے لوازمات بھی حیدرآباد سے منگوائے گئے کہ کہیں اونچ نیچ نہ ہوجائے ۔ غرض بریانی پکانے کے لئے حیدرآبادی ماحول تیار کیا گیا ۔ بریانی پکی لیکن وہ بات پیدا نہ ہوسکی ۔ نواب زادے کو غصہ آیا باورچی کو طلب کیا اور وجہ دریافت کی ۔ باورچی نے ہاتھ جوڑ کر کہا " جان کی امان پاؤں تو عرض کروں ، سب چیزیں تو حیدرآباد کی تھیں لیکن گنڈی پیٹ کے پانی کی کمی رہ گئی تھی ۔ " بریانی کے ساتھ اگر بگھارے بیگن اور ڈبل کے میٹھے کا ذکر نہ کیا گیا تو حیدرآبادی دسترخوان مکمل نہ ہوگا ۔ کوئی گن نہ رکھنے والی ترکاری " بے گن " کو کھٹا لگاکر بگھارے بیگن بنائے جاتے ہیں ۔

معلوم نہیں موسم کا اثر ہے یا حالات کی ستم ظریفی کہ حیدرآبادیوں کا محبوب مشغلہ کچھ نہ کچھ اڑانا ہے ۔ آسمان میں رنگ برنگی پتنگیں اڑتی دکھائی دیتی ہیں تو چھتوں پر لوگ کبوتر اڑاتے نظر آتے ہیں ۔

پتنگ اور کبوتر اڑانے کے علاوہ حیدرآبادیوں کو بے پر کی اڑانے میں کمال حاصل ہے۔ بیٹھے بیٹھے یوں ہی اور خواہ مخواہ کوئی ایک بات اڑا دیتا ہے جو چٹخارے لیتے ہوئے حیدرآبادیوں کے درمیان اونچی اور بہت اونچی اڑتی چلی جاتی ہے۔

اڑانے کے ساتھ حیدرآبادیوں کا "پھرانے" میں بھی نام ہے۔ ہمارے ایک دوست کے مطابق حیدرآبادی "نہیں" کہنے کی ہمت نہیں پاتا۔ ہر دم "ہو" کہتے ہوئے خود بھی گھومتا ہے اور دوسروں کو پھراتا ہے۔

حیدرآباد شہر کی مخصوص سواری "سیکل رکشہ" ہے۔ سیکل رکشہ دوسرے مقامات پر بھی چلتے ہیں لیکن حیدرآباد کے سیکل رکشے منفرد ہوتے ہیں۔ سیکل رکشہ میں بیٹھنے کے لئے اردو حرف تہجی "ا" (الف) جیسے انسان کو انگریزی حرف تہجی "G" کی طرح بن جانا پڑتا ہے۔ اردو سے انگریزی میں "منتقلی" کے لئے کبھی کپڑوں کی قربانی دینی پڑتی ہے تو اکثر و بیشتر اپنے آپ کو زخمی کرلینا پڑتا ہے۔ سر جھکائے زمین کو دیکھتے اپنی آخرت کے بارے میں سوچتے بیٹھنا پڑتا ہے۔ سر اٹھانے کی کوشش پر "ٹھونگا" پڑتا ہے۔ جو لوگ کسی وجہ سے اپنے آپ کو "جی" میں ڈھلنے کے قابل نہیں ہوتے وہ حیدرآباد کی مخصوص سواری سے محظوظ نہیں ہوسکتے۔ اس سواری میں جوتا جانے والا "سو بھی ہے آدمی"۔ سیکل رکشہ میں بیٹھنے والے لوگ موٹے تازے اور فربہ اندام ہوتے ہیں جبکہ رکشہ چلانے کے لئے نحیف و ناتواں، گال پچکے ہوئے کمزور آدمی کی شرط ہوتی ہے۔ سیکل رکشہ کو لنگی پہن کر چلانا سہولت بخش ہے۔ لنگی کے ساتھ بنین خوب جچتی ہے۔ جب لنگی بنین کے ساتھ ٹوپی سر کے بجائے تالو پر آجاتی ہے تو یہ فلموں کا حیدرآبادی کردار بن جاتا ہے اور "لیئو ہنگامہ" کے نعرے لگانے لگتا ہے۔

دوسرے شہروں کی طرح حیدرآباد میں بھی قابل دید مقامات ہیں۔ علم دوست بادشاہ نے کسی ہندوستانی زبان میں پہلی جامعہ قائم کی۔ ہم نے اس جامعہ کو قائم تو رکھا لیکن اس کی انفرادیت کو برقرار نہ رکھ سکے، سو اس جامعہ عثمانیہ کے بدلتے مزاج کو دیکھا جاسکتا ہے۔ فرد واحد کی کارگذاری سالار جنگ میوزیم موجود ہے۔ اپنے آباء و اجداد سے زو میں ملا جاسکتا ہے۔ زو کے ایک حصہ میں حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسانوں کو قید میں تو درندوں کو کھلا چھوڑا جاتا ہے۔ اسے سفاری پارک کہتے ہیں۔ موسیٰ ندی پر بنائے گئے پانچ پلوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی ندی کے کنارے ایک دوسرے کے مقابل عدالت عالیہ اور دواخانہ عثمانیہ ہیں۔ اس محل وقوع میں چھپی مصلحت ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ قلعہ گولکنڈہ اور گنبدیں گزرے دور کی نشانیاں ہیں۔ حسین ساگر نامی جھیل حیدرآباد شہر کو اپنے جڑواں بھائی سکندرآباد سے ملاتی ہے۔ جھیل کے کنارے وقت گذارنا شام کی بہترین تفریح ہے۔ شہر میں مساجد اور منادر تعمیر کے بہترین نمونے ہیں۔ عثمان ساگر کا تالاب ہے، جس کے بارے میں رشید احمد صدیقی نے کہا تھا "سنگ مرمر کا پتھر اور لیلتہ القدر کی رات کے بعد عثمان ساگر کا تالاب کی نادر ترکیب دیکھنے میں آئی ہے۔" ترکیب کی اس الجھن سے بچنے کے لئے ہم حیدرآبادی عثمان ساگر کو گنڈی پیٹ کہتے ہیں۔ معلوم نہیں، ہمارے

گنڈی پیٹ کو کس کی نظر لگ گئی۔آج اس تالاب میں اتنا بھی پانی نہیں ہے کہ ہمارے مہمانوں کو پینے کے لئے ہی پیش کر سکیں۔ہم خود اب ادھر ادھر کا پانی پی کر گذارہ کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک حیدرآباد شہر کا قابل دید مقام "دیوان خانہ" ہے جو کسی زمانے میں حیدرآبادی گھر کی زینت ہوا کرتا تھا۔بقول پرویز یداللہ مہدی آج لوگ آنکھوں دیکھی سے زیادہ سنی سنائی کے قائل ہوگئے ہیں۔ہم نے کوئی دیوان خانہ نہیں دیکھا۔ان کی شان و شوکت، رکھ رکھاؤ اور دبدبے کے تعلق سے سنا ہے۔دیوان خانوں کی تعمیر کا اپنا ایک انداز تھا جہاں حیدرآبادی تہذیب پروان چڑھتی تھی۔ہم نے پس ماندہ دیوان خانوں کو فنکشن پیلس بنتے ہوئے دیکھا ہے۔

"حیدرآباد نگینہ، اندر مٹی اوپر چونا" ہمارے شہر کے تعلق سے یہ کہاوت مشہور ہے۔یہ کہاوت کیسے وجود میں آئی، کوئی ریسرچ اسکالر تحقیق کرکے بتلا سکتا ہے۔ہماری اپنی رائے میں "مسئلے مسائل" اور پریشانیوں کے باوجود ہم جو وضعداری نبھاتے ہیں، اس کی ترجمانی اس کہاوت سے ہوتی ہے۔شاید یہی سبب ہے کہ اس شہر میں مزاح نگاری کو ضرورت سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔زندہ دلوں نے مسکرانے اور قہقہہ لگانے کا مواقع فراہم کرنے کے لئے زندہ دلان حیدرآباد کی بناڈالی۔پہلی عالمی مزاح کانفرنس منعقد کی۔اردو زبان کا منفرد طنزیہ اور مزاحیہ رسالہ شگوفہ پابندی سے نکالتے ہیں۔

نریندر لوتھر نے اپنے مضمون "حیدرآباد کا تغرافیہ" کی ابتداء میں جس خیال کا اظہار کیا تھا اس کو ہم اپنے مضمون کے اختتام پر دہراتے ہیں۔انہوں نے لکھا ہے۔"طویل عرصے سے حیدرآباد پر ایک جامع اور مستند مضمون کی کمی محسوس کی جارہی تھی۔یہ مضمون اس امید کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ اس کو پڑھ کر یہ کمی اور بھی شدت سے محسوس کی جائے گی۔"

جنوری۔۱۹۸۶ء

شہر اردو

آج سے چالیس، پینتیس برس قبل حیدرآباد فرخندہ بنیاد اردو کا شہر تھا۔ چہار طرف اردو کا سکہ چلتا تھا۔ سرکاری، نیم سرکاری اور خانگی کاروبار اردو زبان میں انجام دیئے جاتے تھے۔ حکومت وقت اردو میں گزٹ اور محکمہ جاتی روداد یں شائع کرتی تھی۔ ذریعہ تعلیم اردو زبان تھی۔ غور و فکر اردو میں ہوتا تھا۔ فیصلے اردو میں لکھے جاتے تھے۔ ادب اور شاعری عروج پر تھی۔ ادیبوں اور شاعروں کا بول بالا تھا اور وہ ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ لیکن آج اسی شہر اردو سے اردو شہر بدر ہو چکی ہے۔

دفاتر سے اردو غائب ہے۔ اردو بولنے اور سمجھنے والے نہیں ملتے۔ اپنا معاملہ کر جائیں تو عجیب و غریب صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دفاتر میں اردو درخواستوں کو شرف قبولیت تو بخشی جاتی ہے لیکن کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ ایک مرتبہ ہم نے راشن کارڈ کے لئے اردو میں درخواست دی جو قبول کر لی گئی۔ چند ہفتے بعد اس درخواست کا حشر دیکھ کر ہماری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ افسر مجاز نے اردو میں لکھی گئی عرضی کو الٹا کر (پلٹا کر نہیں) حاشیئے پر انگریزی میں اندراج کیا کہ اس درخواست کو اسٹیٹ آرکائیز STATE ARCHIVES بھیجا جائے تاکہ متن کا ترجمہ حاصل ہو سکے۔

راستوں، سرکاری اور نیم سرکاری عمارتوں پر اردو نظر نہیں آتی ہے اور نہ ریلوے اسٹیشن اور بسوں پر اردو لکھی جاتی ہے۔ بارہا توجہ دلانے اور اردو اخبارات کے کئی کالم سیاہ کرنے کے بعد بادل ناخواستہ کبھی کبھار "اردو نما" کسی زبان میں نام کی تختی لٹکائی جاتی ہے۔

شہر حیدرآباد کو کسی ہندوستانی زبان میں پہلی جامعہ قائم کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ بادشاہ وقت نے جامعہ عثمانیہ قائم کی جس کا ذریعہ تعلیم اردو زبان تھی۔ وقت کے ساتھ جامعہ عثمانیہ سے اردو ایسے غائب کر دی گئی کہ اب صرف اس کے ایمبلم میں "ع" ہی باقی رہا۔ آج کی نسل اس ع کو ایک تجریدی علامت سمجھتی ہے۔

اردو کے شہر میں کل تک جو زبان ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج تھی، اس نے پہلے زبان اول کا درجہ حاصل کیا۔ پھر زبان دوم بنی اور اب زبان بے زبانی ہے۔ کہیں اردو پڑھنے والے موجود ہیں تو پڑھانے والے نہیں ملتے اور جہاں اردو اساتذہ موجود ہوں وہاں اردو پڑھنے والے غائب رہتے ہیں۔ کبھی معجزاتی طور پر اردو اساتذہ اور طالب علم یکجا ہوجاتے ہیں تو اسکول کی عمارت کا تخلیہ کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ایک دوست اردو تحریک سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے چند ایسے اردو مدارس کی نشاندہی کی جن کی عمارتیں بوسیدہ ہو چکی تھیں اور بچوں کی زندگی کو خطرہ لاحق تھا۔ متعلقہ عہدہ داروں نے خبردار کیا کہ بوسیدہ عمارت میں تعلیم حاصل کرنے سے زیادہ خطرہ تو اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے میں ہے۔

زبان تہذیب و معاشرت اور احساسات و جذبات کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔ اردو تہذیب میں صنف نازک کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ چنانچہ صنف لطیف اور صنف کثیف کی گفتگو کے انداز مختلف ہیں۔ یہی اردو کی انفرادیت ہے لیکن مرد اور عورت کے مساوی حقوق کے نعروں نے اردو زبان کو اپنی اس خوبی سے محروم کر دیا ہے۔ آج ہمارے شہر میں لڑکیاں صیغہ تانیث کے بجائے صیغہ تذکیر میں گفتگو کرنے لگی ہیں۔ ایک دن ہم تھکے تھکائے گھر پہنچے تو میز پر خوشبو میں بسی ایک چٹھی ملی۔ لکھا تھا "ڈیر تمہارے شوہر کے آفس جانے کے بعد میں گھر آیا تھا تاکہ کچھ دیر مل بیٹھیں لیکن تمہاری ملازمہ نے بتلایا کہ تم شاپنگ کرنے گئی ہو۔ خیر۔ میں کل اسی وقت پھر آوں گا۔ تمہارا اپنا۔" چٹھی پڑھ کر خون کھول گیا۔ اس سے پہلے کہ ہم اگلا قدم اٹھاتے بیوی نے ٹوکا "سوچ کیا رہے ہیں ہاتھ منہ دھوکر کھانا کھالیجئے اور ہاں شاکرہ کل ملنے آئے گی۔ میں اس کے ساتھ بازار سے آپ کے لئے سوٹ کا کپڑا لے آوں گی۔ جس طرح وہ مردانہ باتیں کرتی ہے، مردانہ کپڑوں کا سلکشن بھی خوب کرتی ہے۔"

اب حیدرآباد میں جو کبھی "اردو آباد" کہلاتا تھا، لوگ خالص اردو زبان میں بات چیت کرنا کسر شان اور ایک طرح کا عیب سمجھنے لگے ہیں۔ اکثر دو، تین زبانوں کو ملاکر کاک ٹیل زبان میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ یوں بھی ہمارا دیش بھانت بھانت کی بولیوں کا ملک ہے اور پھر MASS CULTURE کے زیر اثر کاک ٹیل زبان میں گویا ہونا عیب نہیں ایک لیٹسٹ فیشن ہے۔ اکثر ہمیں ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جن سے ہم اردو میں بات کرتے ہیں تو وہ انگریزی میں جواب دیتے ہیں یا پھر اردو کہتے کہتے انگریزی ہانکنے لگتے ہیں۔ ایک صاحب نے جو خود کو اردو کا عاشق گردانتے ہیں، ہم سے کہا "اردو شاعری میں علامہ اقبال IS JUST THE GREAT"۔ اردو شاعری کی معراج بھی یہی ہے کہ لوگ اس کا اعتراف انگریزی میں کریں۔

آج کل نوجوان اردو کتابیں بر سرعام پڑھنا قدامت پسندی سمجھتے ہیں۔ اردو کتاب کو انگریزی یا دوسری زبان کے اخبار کا لبادہ اڑھاکر کام شاستر جیسے لٹریچر کی طرح دوسروں سے چھپاکر پڑھا جاتا ہے۔ اردو اخبار پڑھنا تو کجا پیکنگ کے لئے بھی استعمال کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ ابھی چند دن قبل ہمارے لڑکے نے اردو اخبار میں ٹفن پلیٹ کرلے جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے ساتھی اخبار دیکھ کر ہنسی اڑاتے ہیں کہ

اس کے گھر اردو اخبار آتا ہے ۔ غرض ہمارے شہر میں وہ تہذیب ہی نہ رہی جس کی شاخ پر اردو زبان نے کبھی اپنا آشیانہ بنایا تھا۔

اردو زبان جس نے انقلابی نثر اور نظم سے جنگ آزادی لڑی تھی، آج اسی پر تہمت ہے کہ وہ ایک بدیسی زبان ہے ۔ تہمت لگانے والوں سے ہم نے پوچھا "بھائی کیسے" ۔ جواب دیا گیا کہ اردو سیدھی جانب سے لکھی جاتی ہے ۔۔ ہم نے حیرت کا اظہار کیا "بس یہی" ۔ جناب نے آنکھیں دکھائیں اور کہا "اور کیا ثبوت چاہیئے ۔ کیا درآمدی لائیسنس دکھائیں ۔ " درآمدی زبان کی تہمت لگانے کے علاوہ دانا دشمن اور نادان دوست اردو رسم الخط تبدیل کرنے کی تحریک چلا کر بے چاری اردو زبان کی عزت کے درپے ہیں ۔ اردو کا اپنا لبادہ کھینچ کر اس کو دیوناگری یا کبھی رومن روپ دینا چاہتے ہیں ۔ وہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ کسی کی چمڑی ادھیڑ دینے سے کیا وہ زندہ رہ سکے گا ۔ علاوہ اس کے ، اردو زبان کا رسم الخط ، بذات خود ایک فن ہے ۔

ہمارے شہر میں اردو زبان سے دلچسپی اب صرف دو طبقوں میں باقی رہ گئی ہے ۔ پہلا طبقہ شاعروں ادیبوں اور نقادوں پر مشتمل ہے اور دوسرا طبقہ سیاست دانوں کا ہے ۔ پہلے طبقے کی اردو سے وابستگی ہمہ وقتی ہوتی ہے جبکہ دوسرا طبقہ موقتی طور پر اردو سے مہر و وفا کا اظہار کرتا ہے ۔

ہمارے ایک انگریزی زدہ دوست روزمرہ کام کاج کے لئے استعمال کی جانے والی زبان کو مادری زبان قرار دیتے ہیں ۔ آج اردو بحیثیت مادری زبان کا یقیناً یہی موقف ہے ۔ اردو زبان سے انسیت ہونے پر فلمی گانے پسند آتے ہیں ۔ بعض لوگوں کو وہ فلمی مکالمے اور گانے بے حد پسند آتے ہیں جو اردو میں لکھے گئے ہوں لیکن یہ لوگ اپنی پسند پر ہندی کا لیبل لگا لیتے ہیں ۔ اردو سے کچھ اور انسیت بڑھتی ہے تو فلمی رسالوں اور جاسوسی ناولوں کا مطالعہ شروع کرتے ہیں ۔ آج ہمارے درمیان کئی افراد کی اردو دانی فلمی رسالوں اور جاسوسی ناولوں کی مرہون منت ہے ۔ اردو سے محبت ہونے پر قوالیوں اور قوالی نما مشاعروں پر سر دھنتے ہیں ۔ قافیہ اور ردیف سمجھ میں آجائیں تو اردو زبان پر دل و جان سے فدا ہو کر شاعری کرنے لگتے ہیں ۔ فلمی دھنوں پر مصرعے فٹ کر کے مشاعروں میں گاتے بھی ہیں ۔ پابند شاعری راس نہ آئے تو آزاد شاعر کا روپ دھار لیتے ہیں ۔ جو حضرات شعری ذوق نہیں رکھتے وہ افسانہ نگار ضرور بن جاتے ہیں ۔ آج کل نثر نگاری میں صفحے کالے کرنا بھی نہیں پڑتا ، صرف چند الفاظ پر مشتمل منی کہانیاں لکھی جا سکتی ہیں ۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جو حضرات فکشن میں ناکام رہتے ہیں وہ نقاد بن جاتے ہیں ۔ ادبیات میں سب سے آسان صنف تنقید نگاری ہے ----- بس یہیں پر اردو زبان کا ارتقائی عمل ختم ہوتا ہے ۔

اردو زبان سے سیاست دانوں کو بھی دلچسپی ہوتی ہے ۔ انتخابات کے موسم میں اردو حکمرانوں اور اپوزیشن جماعتوں کی زبان بن جاتی ہے ۔ ہر قائد اردو کا حامی ، ہمدرد اور شیدا بن جاتا ہے ۔ بارہا یقین دہانی کی جاتی ہے کہ اردو بلا لحاظ مذہب و ملت ہندوستان کی زبان ہے ۔ سرزمین ہند پر پیدا ہوئی ۔ یہیں پلی ، بڑھی اور جوان ہوئی ۔ ہمیں نے اسے سنوارا ، سجایا اور بسایا (اور پھر برباد کیا) ۔ ہمارے شہر کی ہر سیاسی جماعت نے انتخابات سے پہلے وعدہ کیا کہ اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے گا لیکن صاحب ، آج کا معشوق وعدے وفا

کرنے لگا ہے جبکہ سیاست دان ماضی کے معشوق سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔

انتخابات کے قریب اخباروں میں خبریں چھپتی ہیں۔ منسٹر صاحب اردو سیکھ رہے ہیں، وزیر اعلیٰ نے اردو وفد سے مل کر تیلگو میں کہا کہ انہیں اردو پسند ہے۔ فلاں قائد نے اردو کے تعلق سے طویل ترین تقریر کی۔ آخر میں موصوف نے صرف ایک جملہ اردو میں ادا کیا "میرے اوپر ووٹ ڈالو"۔ ایسی تمام خبریں اردو زبان کے لئے اعزاز ہوتی ہیں۔ جلی حرفوں میں ان کی اشاعت عمل میں آتی ہے۔ کبھی کبھار سیاستداں ایک آدھ شعر غلط پڑھ لیں تو اردو کے چاہنے والوں کی عید ہو گئی۔ سیاسی قائدین اردو کے تعلق سے دلچسپ بیانات بھی جاری کرتے ہیں۔ ایک قائد نے کہا "اردو شیروانی کی طرح ہے۔ شیروانی اور اردو کو آج کل مخصوص موقعوں پر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔" دوسرے لیڈر کے خیال میں "اردو کا بچپن یتیمی میں گذرا، جوانی بیوگی میں بیت گئی اور اس کا بڑھاپا بے سہارا ہے۔" کسی اور نے کہا "اردو کو زبردستی پیٹرو ڈالر کے عوض مشرف بہ اسلام نہ کیا جائے، اسے سیکولر رہنے دیا جائے"

حیدرآباد میں ادبی محفلیں اور مشاعرے پابندی سے منعقد ہوتے ہیں۔ اندرون و بیرون ملک سے ادیب اور شاعران تقریبات میں حصہ لیتے اور خوب داد پاتے ہیں۔ دو ایک دن شہر میں اردو کا ہنگامہ بپا رہتا ہے۔ بقول شخصے یہی اردو کے اعراس حیدرآباد کی اردو تہذیب کی باقیات ہیں۔ ویسے ہمارے شہر میں اردو کو زندہ رکھنے کے لئے کئی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں۔ اردو کی انجمنیں، اکاڈمیاں، بورڈ اور مختلف اسوسی ایشن ہیں۔ کوئی محب اردو ہے تو کوئی نگہبان اردو۔ اردو کے لئے ان اداروں کا وجود اسی طرح ہے جیسا کہ سکندر اعظم نے مرتے وقت کہا تھا "میں کئی اطبا کی موجودگی میں دم توڑ رہا ہوں۔"

فروری۔ ۱۹۸۴ء

۴ منارے کا شہر

قدیم بادشاہوں کو یادگار عمارتیں بنوانے کا شوق تھا تاکہ آنے والی نسلیں فخر و محبت سے انہیں یاد کرتی رہیں ۔ محمد قلی قطب شاہ نے چارمینار بنواکر اطراف میں شہر حیدرآباد بسایا ۔ یہ بات غور طلب ہے کہ چارمینار کے لئے شہر بسایا گیا یا شہر حیدرآباد کے لئے چارمینار بنوایا گیا تھا ۔ مورخین سے گذارش ہے کہ وہ اس نکتہ پر تحقیق کریں ۔ ہمیں یہ مسئلہ مرغی پہلے کہ انڈا ، جیسا لگتا ہے لیکن ہمارے لئے اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ چارمینار اور حیدرآباد لازم و ملزوم ہیں ۔ حیدرآباد شہر کا دوسرا نام چارمینار ہے ۔ حیدرآباد کی پہچان بھی چارمینار سے ہوتی ہے ۔ ایک مرتبہ دیار غیر میں ہمارا تعارف کروایا گیا کہ ہم حیدرآباد سے آئے ہیں ۔ جواب میں خوشی کا یوں اظہار ہوا "اچھا آپ چارمینار ہیں ۔" اس وقت ہم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا تھا "نہیں جناب ہمارے صرف دو مینار ہیں ۔" آج جب حیدرآباد کاسموپولیٹن شہر بن چکا ہے ، ہمارے ایک دوست ، حیدرآبادی کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ وہ شخص جو ہر صبح چارمینار دیکھتا ہے اور دن بھر اس کے اطراف منڈلاتا رہتا ہے ۔

چارمینار کے علاوہ ہمارے شہر میں اور بھی تاریخی عمارتیں موجود ہیں ۔ قلعہ گولکنڈہ ، قطب شاہی گنبدیں ، جامعہ عثمانیہ ، عدالت عالیہ ، مکہ مسجد وغیرہ ۔ لیکن جو شہرت چارمینار کو حاصل ہے ، وہ دوسری عمارتوں کے حصہ میں نہیں آئی ۔ چارمینار کا چہار طرف ڈنکا بجنے میں تاریخ سے زیادہ معاشیات کا دخل ہے ۔ چارمینار کی تصویر کے ساتھ چارمینار سگریٹ دور دور تک قانونی انتباہ "تمباکو نوشی صحت کے لئے مضر ہے" پہونچاتا ہے ۔ سوڈا ، چورن اور دوسری اشیاء چارمینار کے نام پر بازار میں خوب کاروبار کرتی ہیں ۔ چارمینار کے مقابلے میں دوسری تاریخی عمارتوں کی مارکیٹ ویلیو نہ ہونے کے برابر ہے ۔ وہ صرف تاریخی اہمیت رکھتی ہیں ۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ نئی نسل حقائق کو مسخ کرنے کی حد تک تاریخ میں دلچسپی لیتی ہے ۔ ہمارے لڑکے نے ایک مرتبہ سوال کیا تھا ۔ "ڈیڈی ۔ تاج محل کس نے بنوایا" ہم نے جواب دیا "ہماری

طالب علمی کے دور میں شاہ جہاں نے تاج محل بنوایا تھا ۔ آج کی بات ہمیں نہیں معلوم ۔ " جواب سن کر ہمارے لڑکے نے تعجب سے کہا " تاریخ کے ماسٹر کہتے ہیں کہ تاج محل ان کے آنجہانی دادا نے بنوایا ہے ۔ " محمد قلی قطب شاہ مرحوم خوش قسمت ہے کہ انہیں ایسے " تاریخی " ماسٹر نہیں ملے ۔ چارمینار بدستور ابھی تک محمد قلی قطب شاہ سے منسوب ہے ۔

چارمینار ایک طرح سے اردو کی عمارت ہے ۔ شمالی ہند سے اردو زبان کی ٹہنی جنوب کی طرف لائی گئی ۔ راستے میں ٹہنی ڈالی بنی جو چارمینار کے اطراف پہنچ کر " ڈغالی " کہلائی ۔ اردو زبان کی ڈغالی چارمینار کے دامن میں ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرتی گئی ۔ چارمینار کے بانی کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے ۔ آج اسی اردو کو چارمینار کی تاریخ لکھنے کے لئے بھی استعمال نہیں کیا جاتا ہے ۔

اکثر بڑے لوگوں کو کسی ایک ہندسے سے پیار ہوتا ہے ۔ یہ ہندسہ ان کے لئے خوش قسمتی کا باعث بھی قرار پاتا ہے ۔ بانی حیدرآباد کو شاید چار کا ہندسہ پسند تھا ۔ چوکور چار میناروں والی عمارت بنوائی اور اس کا نام چارمینار رکھا ۔ لفظ " چار " استعمال کئے بغیر کوئی اور نام بھی رکھا جاسکتا تھا ۔ چارمینار پر چار گھڑیاں نصب ہیں جو چار مختلف وقت بتلاتی ہیں ۔ چارمینار سے چار راستے جاتے ہیں ۔ ایک راستے پر چاندی کا ورق بنانے کی دکانیں تھیں ۔ ان دکانوں سے دور دور تک پہنچنے والی مخصوص آواز آج بھی لوگوں کے کانوں میں گونجتی ہے ۔ دوسرے دو راستوں پر صنف نازک کو خوب سے خوب تر بننے کے لئے لاڈ بازار اور صرافہ مارکیٹ ہیں ۔ بازار کی مہنگائی اور بیوی کی خواہشات سے پریشان حال شوہر کو چوتھے اور آخری راستے سے فرار ہونے کا موقع ملتا ہے ۔ بادشاہ وقت کو چار کے ہندسے سے پھر بھی تسلی نہ ہوئی تو چارمینار سے کچھ دور پانی کا حوض بنواکر اطراف میں چار عدد کمانیں بنوائیں ۔ وقت کے ساتھ حوض کا پانی سوکھتا گیا اور آج بھی بے رونق گلزار حوض " سوکھا حوض " کے نام سے مشہور ہے ۔

چارمینار کے اطراف بسی آبادی کو پرانا شہر، پرانی بستی، " پاتا نگرم " کہا جاتا ہے ۔ پرانا شہر نئے شہر سے مختلف ہے ۔ پرانے شہر میں گنجان آبادی کے باوجود رہن سہن کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ نل میں پانی نہیں آتا ۔ خستہ حال سڑکیں ہیں ۔ برقی آنکھ مچولی کھیلتی ہے ۔ بسیں کم چلتی ہیں ۔ حیران اور پریشان کن محلے اور گلیاں ہیں ۔ بوسیدہ ڈیوڑھیاں اور عمارتیں پروقار ماضی کی یاد دلاتی ہیں ۔ پرانے شہر میں بہت کم دفاتر ہیں جو موقع ملتے ہی نقل مقام کرتے ہیں ۔ ارباب اقتدار اور نہ ہی عہدیدار بستے ہیں ۔ بار با توجہ دلانے کے بعد بانی چارمینار اور حیدرآباد ، محمد قلی قطب شاہ کے نام پر پرانے شہر کے لئے ایک ترقیاتی بورڈ تشکیل دیا گیا ، جس پر بلیک بورڈ کا گماں ہوتا ہے ۔ پرانی آبادی کو بہلانے کے لئے کچھ لکھدیا اور پھر مٹادیا ۔

دور دراز سے لوگ چارمینار دیکھنے آتے ہیں ۔ ہم حیدرآبادی چارمینار دیکھنے والوں کو عجیب و غریب نظروں سے دیکھتے ہیں ۔ بھلا چارمینار بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے ۔ چارمینار دیکھنے والے ہمارے لئے تماشہ ہوتے ہیں ۔ بہت کم حیدرآبادیوں نے چارمینار کو اطمینان کے ساتھ جی بھر دیکھ کر خراج تحسین پیش کیا ہوگا چارمینار کے آس پاس کی جگہ چار سمت جانے والی بسوں سے بھری رہتی ہے جو جگہ بچ رہتی ہے ۔ اس پر میوہ

فروش اور مخصوص "ہر ایک مال" والے ٹھیلے اپنا قبضہ جمائے ہوتے ہیں ۔ بسوں اور ٹھیلوں کے درمیان رکشے ، سیکلیں اور عوام پھنسے رہتے ہیں ۔ مصروف جگہ ، مختلف قسم کی آوازوں اور لوگوں کے ہجوم میں جو شخص بھی چارمینار دیکھتا ہے ، وہ یقیناً تماشہ بن جاتا ہے ۔ اپنے ہی شہر میں تماشہ بننا ہمیں گوارا نہیں ۔

ہم نے کبھی چارمینار کو غور سے دیکھا نہ تھا ۔ مضمون لکھنے کے ارادے سے چارمینار دیکھنے گئے ۔ "موز تین روپیہ درجن ۔۔۔۔ سیب کشمیری سیب ۔۔۔ ہر ایک مال دو روپیہ ۔۔۔۔۔ رکشہ اے رکشہ بار کس چلو گے ۔۔۔۔ اللہ کے نام پر بابا خیرات ۔۔۔" قسم کی مختلف آوازوں اور لوگوں کی ریل پیل میں ہمیں چارمینار بہت اونچا نظر آیا ، اتنا اونچا کہ ہم چار صدیوں میں اس کے لئے کچھ بھی نہ کر سکے ۔ کم از کم چارمینار کے اطراف کچھ ہریالی اور چند پودے ہی اگا لیتے تاکہ دیکھنے والے ٹھنڈی چھاؤں میں آرام سے بیٹھ کر ۴ مناروں کا نظارہ کرتے ۔

مئی ۔ ۱۹۸۴ء

افواہوں کا شہر

مختلف مقامات کے لوگ مختلف خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں ۔ انگریزوں کی وضعداری اور جاپانیوں کی کاریگری مشہور ہے ۔ یہودیوں کی کنجوسی تو اسکاٹ لینڈ کے لوگوں کی بے وقوفیوں کا چرچا عام ہے ۔ مراد آباد کے لوگ دھات کے کام میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تو علیگڈھ کے لوگ تالوں کے فن میں ماہر ہیں اور جناب ہم حیدر آبادی افواہوں کو جنم دینے انھیں پھیلانے اور ان سے نقصان اٹھانے میں نام کمانے لگے ہیں ۔

ہم نے ایک انگریزی کتاب میں ایک کہانی " آسمان گر رہا ہے " پڑھی تھی ۔ مرغی کا چوزہ درخت کے نیچے دانہ چگ رہا تھا کہ اس کے سر پر ایک پتہ آن گرا ۔ اس نے صدا لگائی " آسمان گر رہا ہے " اور جنگل کے بادشاہ کو آسمان گرنے کی اطلاع دینے کے لئے دوڑنے لگا ۔ راستے میں چند مرغیاں اور بطخیں ملیں ۔ سبھی نے اس واقعے کو سنا ، آسمان گرنے پر تشویش کا اظہار کیا اور چوزے کی قیادت میں بادشاہ کو اطلاع دینے جلوس کی شکل میں جانے لگے ۔ لومڑی سے ملاقات ہوئی ۔ آسمان گرنے کے واقعے پر افسوس کرتے ہوئے جنگل کے بادشاہ سے ملانے کے لئے وہ چوزہ اور اس کے ساتھیوں کو ایک غار میں لے گئی ۔۔۔۔۔۔ کچھ اس کہانی جیسا حال ہمارے شہر کا ہے ۔ ہمیں ہر شہری ایک چوزہ دکھائی دیتا ہے ۔ " پتے " کے مانند کبھی پانی آتا ہے تو کبھی مردہ قبر سے بات کرنے لگتا ہے ۔ کبھی فائرنگ کی آواز آتی ہے تو کبھی زلزلہ آتا ہے ۔ پھر جناب شہر پر من برسانے والا آسمان خود گرنے لگتا ہے اور شہریوں پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے ۔

ہم یوں ہی نہیں کہہ رہے ہیں کہ حیدر آباد " افواہوں کا شہر ہے ۔ " ہمارے پاس اس دعوے کا دستاویزی ثبوت موجود ہے ۔ چند سال قبل (ستمبر ۱۹۷۰ء) " پانی آیا ۔۔۔۔ پانی آیا ۔۔۔۔۔ " ایک زبردست افواہ اخباروں کی زینت بن چکی ہے ۔ سر شام جب زندگی کی ہماہمی تیز تر تھی ۔ لوگ اپنے اپنے گھر لوٹ رہے تھے ۔ ایک افواہ شہر میں پانی بہالے آئی ۔ لوگ " پانی آیا ۔۔۔۔ پانی آیا ۔۔۔۔ " کا نعرہ لگاتے اونچے

مقامات کی طرف دوڑنے لگے۔ پوچھنے پر کہ "بھائی پانی کہاں ہے۔" ہر کوئی کہتا "میرا پیچھا کرتا آرہا ہے۔" افواہ کے پیچھے ہم اور ہمارے پیچھے افواہی پانی کچھ کم آدھے گھنٹے تک دوڑتا رہا۔ تھکنے کے بعد بے مقصد دوڑ کا احساس ہوا۔ "پانی آیا" کی پریشانی چھوڑ کر بھاگنے کے دوران چھوڑی ہوئی اشیاء کو جمع کرنے کی فکر ہوئی۔ جوتے اور چپلوں کو تو خیر کوئی ڈھونڈا نہیں، ہینڈ بیاگ، منی پرس، گھڑی، توشہ دان، بیوی بچے، احباب اور دوسری چیزوں کی تلاش جاری رہی۔ چند لوگوں کا اثاثہ ایسے گم ہوا کہ پھر ملا ہی نہیں۔ ہمارے ایک شاعر دوست کی محبوبہ نے اسی "پانی آیا۔۔۔ پانی آیا۔۔۔" دوڑ میں شاعر صاحب کا ساتھ چھوڑا تھا۔ فراق میں صاحب موصوف چار دیوان کے مالک بن بیٹھے ہیں۔

ہم نے افواہ کے ذریعہ طغیانی لانے پر قناعت نہیں کی۔ "افواہی زلزلہ" بھی لے آئے، شہر ہلنے لگا۔ کانوں میں گڑگڑاہٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ مکانات سے باہر نکل پڑے کہ کہیں ہلتے ہلتے مکان ان پر گر نہ جائے۔ جب افواہی زلزلہ تھم گیا، لوگ اپنے اپنے گھر واپس ہوئے تو پتہ چلا کہ گھروں سے کئی اشیاء غائب ہو چکی ہیں۔

افواہی طغیانی اور زلزلے کے علاوہ ہمارے شہر میں وقتاً فوقتاً مختلف قسم کی افواہیں اڑائی اور پھیلائی جاتی ہیں۔ کسی کے انتقال پر ملال کی خبر پھیلانا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ انتقال کی افواہ اتنی سنجیدگی اور وثوق سے اڑائی جاتی ہے کہ مرحوم و مغفور خود اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیں تب بھی انہیں مردہ اور انہیں ان کا بھوت سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ افواہی انتقال کرنے والا شخص طویل عمر پاتا ہے۔ کیا عجب کہ لوگ خود اپنے انتقال کی اطلاع احباب کو دیتے ہوں۔ آپ سے کیا چھپائیں اب تک خدا کے فضل و کرم سے ہمیں دو مرتبہ مار ڈالا گیا ہے۔

افواہوں نے مردہ لوگوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ ہمارے شہر میں افواہوں نے مردہ لوگوں کو زندہ کیا ہم نے ان سے بات کی۔ قبر کے حالات دریافت کیئے۔ کچھ عرصہ قبل ایک مرحوم کی قبر سے بات کرنے کی اطلاع اخباروں میں چھپ چکی ہے۔ مرحوم نے اپنے گھر والوں کی خیر خیریت دریافت کی۔ بریانی پر فاتحہ دے کر دوستوں کو پیٹ بھر نہ کھلانے پر ورثا کو ڈانٹا اور نئی ہدایات دیں۔ اس خبر کے عام ہوتے ہی قبر کے اطراف لوگوں کا مجمع لگنے لگا۔ لوگ اپنی مشکلات اور تکالیف کا حل پوچھنے لگے۔ نذر و نیاز چڑھانے لگے۔ کچھ دن بعد تحقیق پر پتہ چلا کہ قبر سے جو آواز آرہی تھی وہ ایک چوہے کی تھی۔

بیان کیئے گئے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارا شہر افواہوں کا گڑھ ہے۔ لفظ گڑھ کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاید اعراب کی تبدیلی کے ساتھ "گڑُھ" کی اصطلاح چل نکلی تھی۔ جب کوئی ناقرین قیاس بات سنائی دیتی تو حیدرآبادی، "گڑُھ ۔۔۔ گڑُھ ۔۔" کا نعرہ بلند کرنے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔ ایک عرصہ تک افواہوں کے بجائے، "گڑُھ ۔۔۔ گڑُھ ۔۔۔" فضاؤں میں گونجتا رہا۔

افواہیں اور فسادات ایک سکے کے دو رخ ہیں۔ یہ کھوٹا سکہ ہمارے شہر میں خوب چلتا ہے۔ فسادات کا موسم افواہوں کے لئے زرخیز اور شاداب موسم ہوتا ہے۔ ہمہ اقسام کی افواہیں جنم لیتی، پھلتی

پھولتی اور پھیلتی ہیں ۔ جلوس پر پتھراؤ کی افواہ اڑتی ہے ۔ جلوسی مشتعل ہو جاتے ہیں اور فساد برپا ہوتا ہے ۔ کہیں بم پھٹا تو کہیں فائرنگ ہو رہی ہے ۔ کسی جگہ حملے کا امکان ہے تو کسی محلے میں باہر سے لوگ آئے ہیں ۔ افواہیں ٹھوس دلائل کے ساتھ جنم لیتی اور اس تیزی سے پھیلتی ہیں کہ ارباب حکومت کو تردید کرتے نہیں بنتی ۔ پچھلے فسادات میں افواہیں پھیلانا ہمارے شہر میں قابل دست اندازی جرم قرار دیا گیا ۔ اس سے بڑھ کر افواہوں کا حقیقت پسندانہ اعتراف اور کیا ہو سکتا ہے ۔

ماضی میں افواہیں دروغ گوئی کا نتیجہ ہوا کرتی تھیں ۔ آج انہیں ہوشیاری اور چابکدستی سے شروع کرنا اور پھیلانا پڑتا ہے ۔ افواہیں گڑھنا اور پھیلانا ایک آرٹ اور فن کا درجہ اختیار کر گیا ہے ۔ ایسی افواہیں اڑائی جاتی ہیں کہ تعریف کرتے نہیں بنتی ۔ چند دن قبل ایک صاحب نے ہم سے کہا "آج امریکہ میں جو مشینی آدمی یا روبوٹ کی دھوم مچی ہوئی ہے وہ مریخ کی مخلوق ہے ۔ اڑن طشتریوں کے ذریعہ سفر کرتے ہوئے دس سال قبل یہاں آئے تھے اور ملازمت کے لئے منت سماجت کرتے رہے ۔ ہمیشہ کی طرح ہم خواب غفلت میں رہے ۔ مایوس ہو کر ان لوگوں نے امریکہ کا رخ کیا ۔ امریکہ میں انہیں گرین کارڈ دیا گیا ۔ میں نے محلے والوں کی مخالفت کے باوجود گھریلو کام کاج کے لئے دو زنانہ روبوٹ کو رکھ لیا تھا لیکن تمہاری بھابی نے اتنا ستایا کہ انہیں یہاں سے بھاگ کر ہی چھٹکارا حاصل ہوا ۔ "

اہم واقعے کے بعد کچھ ایسے ہی واقعے کی افواہ اڑانا اور پھیلانا ایک دستور بن گیا ہے ۔ کسی کی ناگہانی موت کے بعد دو ایک اشخاص کو یقینی طور پر مار ڈالا جاتا ہے ۔ اصلی طوفان کے بعد نقلی طوفان آتے ہیں ۔ زلزلے کے بعد کئی دن تک افواہی زلزلے آتے رہتے ہیں ۔ ہمیں خوب یاد ہے ایک مرتبہ بوندا باندی کے دوران پڑوسیوں کے ساتھ چائے پیتے ہوئے ہم نے ۱۹۰۸ء کی طغیانی کا ذکر کیا تھا ۔ جب ہم گھر پہنچے تو ہمیں شہر میں آئے افواہی طوفان کی اطلاع ملی ۔ شہر کی مشہور تاریخی عمارت زمین بوس ہو گئی ۔ تالاب بہہ گیا ۔ سڑکیں پانی میں ڈوب گئیں اور کئی لوگ پانی کی نذر ہو گئے!

ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی میں افواہوں کی ضرورت پڑتی ہے ۔ افواہوں کے بغیر زندگی کا رنگ پھیکا معلوم ہوتا ہے ۔ ازدواجی زندگی میں شوہر کے لئے افواہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بنتی ہیں ۔ یار دوستوں کی محفل سے لوٹنے کے بعد افواہ گھڑنی پڑتی ہے ۔ سیاست میں افواہوں کے سہارے لیڈر اپنی دکان چمکاتے ہیں ۔ " غریبی ہٹاؤ " " بے روزگاری دور کرو " " قومی یک جہتی عام کرو " " ہم ایک ہیں " اور ایسے ہی کئی افواہی نعرے ہم بچپن سے سنتے آرہے ہیں ۔ ہمارا تجربہ ہے کہ انتخابات میں اسے زائد ووٹ ملے جس نے سب سے زیادہ افواہیں گھڑی اور ڈینگیں ماری تھیں ۔ صحافت میں بھی افواہوں کی اہمیت روز بروز بڑھتی جاری ہے ۔ افواہوں کو باوثوق ذرائع کا نام دیا جاتا ہے ۔

افواہوں سے مزاح نگاری کو بہت فائدہ پہنچتا ہے ۔ افواہوں اور مزاح نگاری میں چولی دامن کا رشتہ ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ افواہوں کے شہر حیدرآباد میں مزاح نگاروں کی بہتات ہے ۔ فائیلوں میں کھوئے ہوئے سنجیدہ افسران، طالب علموں کو علم کی دولت بانٹنے والے اساتذہ، مسیحائی کرنے والے ڈاکٹر، عمارتیں

بنانے والے انجنیر اور آرکیٹکٹ، غرض ہر کوئی محمد قلی قطب شاہ کے شہر میں افواہوں سے متاثر ہو کر مزاح نگاری کی طرف مائل ہوا۔

شہر حیدرآباد زندہ باد، افواہوں اور زندہ دلوں کا شہر پائندہ باد!

فروری۔ ۱۹۸۵ء

"ہمارا شہر خوبصورت ہے"

ہمیں نہیں معلوم کہ خواندگی سے زندگی کا معیار بلند ہوتا ہے یا نہیں لیکن خواندگی کے تناسب میں اضافے سے نعرے لکھنے کا فن ضرور ترقی کرتا ہے ۔ ماضی کے برخلاف آج ہمارے شہر میں جگہ جگہ کوئی نہ کوئی نعرہ لکھا نظر آتا ہے ۔ ہر دیوار ایک نوشتہ علم ہے ۔ کہیں "ہم دو ہمارے دو" تحریر ہے تو کہیں "مزدور اتحاد زندہ باد" کا نعرہ لکھا ہے ۔ ایک بورڈ پر "کتے آپ کے دوست ہیں" تو دوسرے پر "کمزور طبقات پر ظلم نہ کیجئے" پینٹ کیا ہوا ہے ۔ نعروں کے ہجوم میں یہ نعرہ ایک عرصہ تک ہمارے شہر کی زینت بنا رہا ۔

"ہمارا شہر خوبصورت ہے، اسے خوبصورت بنائے رکھیئے" ۔

اس نعرے کی خوبی یہ تھی کہ ہر کسی کی توجہ اپنی جانب مبذول کرواتا ۔ جسے دیکھیئے نعرے کے سامنے یا نیچے کھڑے ہو کر سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کاندھے اچکا کر اور ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی راہ لگتا ۔ ہم نے بھی کئی مرتبہ اس نعرے کے بارے میں غور و فکر کیا ہے لیکن پتہ نہیں چلا کہ ہمارے شہر کی خوبصورتی کیا ہے اور کیسی ہے ۔ جب ہمیں اپنے شہر کی خوبصورتی ہی پلے نہ پڑی تو شہر کو خوبصورت بنائے رکھنے کا سوال کہاں اٹھتا ہے ۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ حیدرآبادی مختلف طریقوں سے شہر کو بدصورت بنانے کی کوشش میں منہمک رہتے ہیں ۔ فرقہ وارانہ فسادات سرفہرست ہیں ۔ اس موضوع پر کیا لکھیں ۔ لکھتے لکھتے سیاہی بلکہ خون خشک ہو چکا ہے ۔ کسی کے الفاظ میں "حیدرآباد شہر اور اس کے شہریوں کو فسادات کی عادت ہو گئی ہے ۔"

اس نعرے سے کئی غلط فہمیوں نے جنم لیا ۔ دوسرے شہروں کے لوگ حیدرآباد آئے ۔ اس نعرے کو پڑھا اور ایمان لے آئے ۔ انہیں شہر واقعی خوبصورت لگا وہ یہیں بس کر حیدرآباد کی خوبصورتی کا فائدہ اٹھانے لگے ۔ حیدرآباد کی متوطن آبادی نے جب اس نعرے کو پڑھا اور حقیقت کے خلاف پایا تو ہجرت کر کے دوسرے شہروں میں بسنے لگی ۔ ہمارا شہر اس نعرے کی بنا پر کاسموپولیٹین شہر بنا ہے ۔ کاسموپولیٹن شہر

کی تعریف بھی یہی ہے کہ ایسے شہر میں دوسرے شہروں کے متوطن لوگ بستے ہیں جبکہ خود اس کے متوطن، دوسرے شہروں کا رخ کرتے ہیں۔

انسانی تاریخ میں اکثر خوبصورت موڑ آتے ہیں لیکن خوبصورت شہر میں ہر موڑ خطرناک ہوتا ہے۔ ہمارے شہر کے راستوں میں کئی موڑ بلکہ قدم قدم پر ایک موڑ ہے۔ موڑ پر کسی سواری یا خود موڑ سے ٹکرائے بغیر گذر جانا ایک معجزہ سے کم نہیں۔ پتہ نہیں چلتا کہ کب ملک الموت بن کر اچانک کوئی سواری سامنے سے بھڑ جائے۔ ہر موڑ پر کچرے کا ڈھیر ایک مستقل فیچر ہے۔ کچرے کے اطراف آس پاس کے بچوں کا پیش کردہ صبح کے آرٹ کا منظر بکھرا پڑا ہوتا ہے۔ دور سے بو آنے لگتی ہے۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ حیدرآبادی اگر ناک پر کپڑا رکھنے لگیں تو شاید پہننے کے لئے کپڑا نصیب نہ ہو۔ اسی لئے ہم نے اپنی ناک کو اس بو کا عادی بنالیا ہے۔ کوئی حیدرآبادی اس بو سے بچنے پر مصر ہے تو اسے کوئی بڑا سیاسی عہدہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ شہر میں "بڑے آدمی" کی آمد پر کچرا صاف کیا جاتا ہے۔ جراثیم کش پاوڈر کا چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ سڑکوں کی مرمت کی جاتی ہے۔ اسٹریٹ لائٹس کو کارکرد بنایا جاتا ہے۔ ہر حیدرآبادی بڑا آدمی نہیں بن سکتا، خوبصورت شہر کا عام شہری راستوں پر اچھلتے کودتے اور گرتے اٹھتے بدبو میں چلنے کا عادی ہوجاتا ہے۔

"ہمارا شہر خوبصورت ہے" انسانوں سے زیادہ جانوروں کو اس نعرے پر یقین محکم ہے۔ مچھر، مکھیاں اور چوپائے سال کے بارہ مہینے شہر میں مستقل ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں۔ جب دیکھئے شہر کی خوبصورتی کا فائدہ اٹھاکر شہریوں میں بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ مویشی سڑکوں پر انسانوں سے زیادہ آزادانہ گھومتے پھرتے ہیں۔ چوراہے اور سہ راہے مویشیوں کے پسندیدہ مقامات ہیں جہاں وہ جگالی کرتے ہوئے محفل مشاعرہ یا مذاکرہ منعقد کرتے ہیں۔ سڑکوں پر جانوروں کی فری اسٹائل کشتی اور آپسی محبت اور عہد و پیماں کے خوبصورت نظارے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کبھار جانور شہر کی بے ہنگم ٹریفک کو سڑک کے بیچ کھڑے ہوکر کنٹرول کرتے ہیں۔ ٹریفک پر قابو اتنا موثر ہوتا ہے کہ اکثر ٹریفک رک جاتی ہے۔ روزمرہ کی ان حرکات و سکنات کے دوران اگر حیدرآبادی مداخلت کریں تو مویشیوں کو غصہ آتا ہے اور وہ شہریوں کی خوبصورتی بگاڑنے پر تل جاتے ہیں۔ ہم ایسے ہی ایک حادثہ سے دوچار ہوئے۔ گدھے کی دولتی کھاکر کئی دن فریش رہے۔ احباب عیادت کے لئے آتے اور کہتے "آپ نے کمال کر دیا۔ ٹکر بھی لی تو گدھے سے، برادری کا معاملہ لگتا ہے۔"

ترقی اپنے ساتھ کچھ تقاضے اور تحدیدات لے آتی ہے۔ ہمارا شہر ترقی کرنے کے باوجود اپنے شہریوں پر کوئی پابندی عائد نہ کرسکا۔ شاید اس لحاظ سے ہمارا شہر خوبصورت ہے۔ حیدرآبادی ایک دوسرے کی زمین پر قابض ہوسکتے ہیں۔ سڑکوں پر دھڑلے سے کاروبار کرسکتے ہیں۔ راستوں پر اپنے مکان اور دکان بڑھا سکتے ہیں۔ جب چاہیں، جہاں چاہیں اور جیسے چاہیں ایک یا دو انگشت والی ضرورت پوری کرسکتے ہیں۔ کوڑا کرکٹ پھینکنے اور پان کی پیک تھوکنے کے لئے مقام کی قید نہیں ہے۔ کوئی چاہے تو شہریوں پر کچرا

پھینک سکتا ہے ۔ پان کی پیک سے کپڑے خراب کر سکتا ہے ۔ موز کے چھلکے پھینک کر شہریوں کی ہڈیاں تڑوا سکتا ہے ۔ چند شہریوں نے جنہیں شاید اس نعرے کی سچائی پر یقین تھا، شہر کی خوبصورتی قائم رکھنے اور کچرا ہٹانے کا مطالبہ کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ کو کوڑا کرکٹ بھینٹ کیا ۔ اس تحفے کے باوجود بھی ہمارا شہر خوبصورت نہ بن سکا ۔

ہمارا شہر پوسٹرس اور اشتہارات کا شہر ہے ۔ راستوں کے دونوں جانب اور اوپر ہورڈنگس اور پوسٹرس لگے ہوتے ہیں تو سڑک پر اشتہارات لکھے ہوتے ہیں ۔ مصروف سڑکوں اور خطرناک راستوں پر پوسٹرس اور اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہے ۔ حد نگاہ تک پوسٹرس ہی پوسٹرس نظر آتے ہیں جن میں فلمی اداکار کم سے کم لباس میں حسین و جمیل نظر آتے ہیں ۔ ان کا تصوری حسن، ادائیں اور ہوش ربا مناظر شہریوں کا دل موہ لیتے ہیں ۔ حیدرآبادیوں کی پسندیدہ تفریح پوسٹرس سے شروع ہوکر فلم بینی پر ختم ہوتی ہے ۔ اکثر شہری پوسٹر بینی کے لئے پیدل چلتے ہیں ۔ شہر کے کئی مقامات پر پوسٹرس کے سامنے عوام کا ہجوم نظر آتا ہے ۔ پوسٹرس کی وجہ سے راہ گیر راستہ بھی بھٹک جاتے ہیں ۔ ہمارے خیال میں حیدرآباد شہر میں پوسٹرس خوبصورت لگتے ہیں لیکن صرف پوسٹرس کی خوبصورتی سے متاثر ہوکر ہمارا شہر خوبصورت ہے کہنا شاید زیادتی ہے بلکہ یہ بھی ایک فلمی ڈائیلاگ لگتا ہے ۔

محمد قلی قطب شاہ کے شہر میں ایک ندی بہتی ہے ۔ سال میں صرف ایک مہینہ موسی ندی، ندی کی تعریف میں آتی ہے ۔ پانی روانی سے بہتا ہے ۔ بقیہ گیارہ مہینوں میں ندی، نالی بن جاتی ہے ۔ پانی کے بجائے شہر کے فاضل اور فضول مادے کو بہایا جاتا ہے اور ندی کے دامن میں انسانوں کے لئے مچھر اور مویشیوں کے لئے گھاس کی کاشت کی جاتی ہے ۔ ندی کے کناروں پر شہر کے تین بڑے دواخانے موجود ہیں جہاں علاج کے ساتھ مریضوں کو مکھیوں اور مچھروں سے کٹواکر ایک نئے مرض کے ساتھ گھر روانہ کیا جاتا ہے ۔ ندی بلکہ نالے کے کنارے دواخانوں کا وجود بھی ہمارے شہر کی چند خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے ۔

شہر حیدرآباد کی سرحد جہاں اپنے جڑواں بھائی سکندرآباد سے ملتی ہے وہاں ایک جھیل ہے ۔ جھیل کی سطح پر آبی پودے اگے ہوئے ہیں جو مچھروں کی افزائش کرتے ہیں ۔ جھیل کے آس پاس کی فیکٹریوں سے خارج شدہ مادے جھیل میں پہنچ کر مچھلیوں کو مار ڈالتے ہیں ۔ ہم حیدرآبادی سرِشام کھلے آسمان کے نیچے تفریح کے لئے اس جھیل پر جمع ہوتے ہیں ۔ عجیب اور گندی بو سونگھتے اور اپنے آپ کو مچھروں سے کٹواتے ادھر ادھر کھجاتے تفریح کا مزہ اٹھاتے ہیں ۔ اس جھیل کے علاوہ خوبصورت شہر میں چند باغ بغیچے اور ایک عدد پہاڑ بھی ہے ۔ ہمارے ایک دوست کہتے ہیں "شہر کے باغ باغیچوں میں ہری گھاس پر بیٹھنا تو دور گھاس کھانے کی لئے بھی نصیب نہیں ہے ۔ جہاں سبز فرش اگا رہتا ہے وہاں شہریوں کا داخلہ ممنوع ہے تاکہ باغ کی خوبصورتی قائم رکھی جائے یوں بھی شہر کے باغ میں داخلہ اخلاقاً ممنوع ہے ۔ وہاں کئی خاندان بسیرا کئے ہوتے ہیں ۔ کسی کی تنہائی میں مخل ہونا اچھی بات نہیں ہے ۔ یہ بھی خوبصورت شہر کا ایک خوبصورت پہلو ہے ۔

شہر میں تاریخی عمارتیں اس لئے موجود ہیں کہ ہمارے شہر کی بھی ایک تاریخ ہے ۔ تاریخی عمارتوں کی حفاظت کرنا شاید ہماری روایات کے خلاف ہے ۔ چند تاریخی عمارتیں جن کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے اب ان کا نشان نہیں ملتا اور جو عمارتیں باقی ہیں وہ ڈھ جانے کا انتظار کر رہی ہیں ۔ مشہور عمارت چارمینار کے دونوں جانب چند برقی قمقمے لگا کر ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا شہر خوبصورت ہے ۔

" ہمارا شہر خوبصورت ہے ، اسے خوبصورت بنائے رکھئیے " یہ نعرہ شہر حیدرآباد کی خوبصورتی بگاڑنے اور بدصورتی قائم کرنے والے محکمہ کی جانب سے شہریوں کو خوش فہمی میں مبتلا کرنے کے لئے دیا گیا تھا ۔ جانے کیوں آج یہ نعرہ کہیں نظر نہیں آتا ۔ شاید محکمے کو اپنی اہلیت اور حیثیت کا ٹھیک اندازہ ہوگیا ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خوبصورت شہر کے معنی و مفہوم سمجھ میں آگئے ہوں ۔ لیکن صاحب ہمارے لئے ہمارا وطن مالوف ان تمام نقائص کے باوجود صرف خوبصورت ہی نہیں جنت نشان بھی ہے ۔

نومبر ۔ ۱۹۸۴ء

خاکی نیکر اور سفید بنین

ہم نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ اگلے وقتوں کے لوگ ڈاکوؤں اور دیگر خطرات کے پیش نظر آبادیوں کے اطراف فصیل یا خندق کے حصار باندھ کر رہا کرتے تھے ۔ وقت کے ساتھ مضبوط حکومتیں قائم ہوئیں اور لوگوں میں خوف و ہراس ختم ہوا ۔ شہری آبادی ڈکیتیوں سے محفوظ ہوئی ۔ ڈاکو اپنا نشانہ چھوٹے قصبات اور مواضعات میں تلاش کرنے لگے ۔ لیکن صاحب ، حیدرآباد کی خوبی اور ڈاکوؤں کی دیدہ دلیری دیکھئیے کہ آج کے دور میں جبکہ قانون کے ہاتھ لانبے ہو چکے ہیں، ہمارے شہر میں ڈاکے پڑتے ہیں ۔ جہاں ڈکیتیاں ہوتی ہیں وہاں چوری ، رہزنی اور دھوکہ دہی معمول کی باتیں قرار پاتی ہیں ۔

پچھلے چند سال سے ہمارے شہر میں ڈاکہ زنی کا سلسلہ چل پڑا ہے ۔ شہر کے ہر حصے اور ہر محلے میں ڈاکوؤں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے ۔ ہر ڈکیتی کے بعد وہی ایک کہانی دہرائی جاتی ہے ۔ ڈاکو آدھی رات گذرنے کے بعد دروازہ توڑ کر حملہ آور ہوئے ۔ آس پاس کے مکانات کو باہر سے بند کر دیا تھا ۔ ڈاکو تیلگو اور ہندی میں بات کر رہے تھے ۔ خاکی نیکر اور سفید بنین پہنے ہوئے تھے ۔ ڈاکوؤں کی عمر بیس اور تیس سال کے درمیان تھی ۔ پتھروں اور لاٹھیوں سے لیس تھے ۔ ایک ڈاکو کے پاس طمنچہ بھی تھا ۔ مدافعت کرنے والے مکینوں کو زخمی کر دیا گیا ۔ زیور مالیتی کئی ہزار روپیہ ، چند ہزار روپے نقد اور دوسری قیمتی اشیاء لے کر فرار ہو گئے ۔ پولس نے کیس درج رجسٹر کر لیا ہے ۔ ہر ڈکیتی کے بعد ہمیں ڈاکوؤں کے بارے اس کہانی سے زاہد کچھ بھی معلوم نہ ہوتا ۔ پولیس کوئی دور یا قریب کی کوڑی نہ لا پاتی ۔ پولس اتنی ڈکیتیوں کے بعد یہ اطلاع تک نہ دے سکی کہ ڈاکو گبر سنگھ ہے یا مان سنگھ یا پھر ڈاکو سنگرام یا پھولن دیوی کے آدمی ہیں یا بلیک کوبرا ، بلیو کیٹ ، ڈبل زیرو جیسے گروہ ہمارے شہر میں سرگرم عمل ہیں ۔ ہمیں پولس سے امید نہیں ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا اتہ پتہ چلائے گی ۔ ہم ڈاکوؤں سے ہی گذارش کرتے ہیں کہ وہ اپنا یا اپنے گروہ کا نام بتلا کر ڈاکہ ڈالیں تاکہ رات میں جب بچے روئیں تو حیدرآبادی انہیں ڈرا سکیں ۔ " سو جا بیٹا ۔ نہیں تو گبر سنگھ آجائے گا

---- اور پولس والے کچھ نہ کر سکیں گے ۔"

ڈکیتی کے بعد ڈاکو فرار ہو جاتے ہیں ۔ زخمیوں کی مرہم پٹی ہو جاتی ہے ۔ مکین رو دھو کر خاموش ہو جاتے ہیں ۔ پڑوسی مکینوں کو پرسہ بھی دے جاتے ہیں ۔ تب کہیں شہر کی پولس مقام واردات پر وارد ہوتی ہے ۔ سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے کے مصداق پولیس کی تفتیش شروع ہوتی ہے ۔ مختلف سوالات کئے جاتے ہیں ۔ ڈاکوؤں کی آمد کے وقت آپ کیوں سو رہے تھے ۔ ڈاکوؤں کی تعداد اور جنس لکھائیے ۔ ڈاکوؤں کا حلیہ بتائیے ۔ ڈاکوؤں کی چال کیسی تھی ۔ ان کے شناختی نشان بتلائیے ۔ اپنے کسی رشتہ دار پر ڈاکوؤں کا شبہ تو نہیں ہے ۔ ڈاکے میں کسی بیرونی ہاتھ کا امکان تو نہیں ہے ۔ مسروقہ سامان آپ نے کیسے اکٹھا کیا تھا ۔ سامان کی رسیدیں دکھائیے ۔ اتنی رقم آپ گھر پر کیوں رکھتے ہیں ۔ کیا آپ نے مسروقہ رقم کا انکم ٹیکس ادا کیا تھا ۔ اور ایسے کئی سوالات کئے جاتے ہیں ۔ جوابات قلمبند کرنے کے بعد پولس لٹے پٹے گھر اور زخمی مکینوں کی تصاویر لیتی ہے جو دوسرے دن اخباروں میں چھپتی ہیں ۔ پولیس اپنے کتوں کو ڈاکوؤں کی بو سے آشنا کرواتی ہے ۔ ڈاکوؤں کے ہاتھوں اور پیروں کے نشان لئے جاتے ہیں ۔ تفتیش مکمل ہونے کے بعد پولس ڈاکوؤں کی تلاش شروع کرتی ہے ۔ کتوں کی مدد سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکو انٹی میٹ INTIMATE سینٹ استعمال کرتے ہیں ۔ دوران تلاش پولس کو اہم سراغ ہاتھ لگتے ہیں جن سے ملزمین کی گرفتاری یقینی ٹھہرائی جاتی ہے ۔ حقیقتاً یہ سراغ وہ "سوراخ" ثابت ہوتے ہیں جن سے ڈاکو (ہاتھ سے) نکل جاتے ہیں ۔

ڈاکوؤں سے مدافعت خطرناک ہوتی ہے ۔ ابتداً ان سے مقابلہ کیا گیا ۔ مالی نقصان کے ساتھ کسی کا سر پھٹ گیا تو کسی کی ہڈی پسلی گولہ ہوئی ۔ چند شہریوں کی جانیں بھی گئیں ۔ اب لوگ ڈاکوؤں سے مفاہمت پر آمادہ ہیں آخر جان ہے تو جہان ہے ۔ ایک شہری نے اپنے گھر میں ڈاکہ پڑنے کی تفصیل سنائی "ڈاکو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہم نیند سے بیدار ہوئے ہم نے دروازہ نہ توڑنے کی التجاء کی اور کہا کہ بھائی صاحب آپ ڈاکے کی نیت کر کے آئے ہیں تو ہم دروازہ کھول دیتے ہیں ۔ ہم نے دروازہ کھول دیا ۔ گھر کی کنجیاں ڈاکوؤں کے حوالے کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا ۔ میں فلاں ابن فلاں ایک بینک کلرک ہوں ۔ کثیر العیال ہوں ۔ آپ سے مل کر خوشی بے حد خوشی ہوئی ۔ گھر کا اثاثہ ہم سب کا ہے ۔ جو چیزیں آپ کو درکار ہوں بصد شوق لے جائیے لیکن اہنسا کے ساتھ ۔ ہمارا دیش آہنسا کا دیش ہے اور ہم آہنسا وادی ہیں ۔ ڈاکوؤں نے مکان کی تلاشی لی ۔ اشیاء کو تھیلے میں بھرا ۔ تھیلہ بند کیا ہم سے کہا کہ وقت دیکھ لیں اور اپنی گھڑی انہیں دیدیں ۔ ہم نے وقت دیکھا اور پچیس سالہ وفادار گھڑی ان کے حوالے کر دی ۔ ہم اپنے مہمانوں کو چائے پلانا چاہتے تھے لیکن وقت کی کمی کے سبب ڈاکوؤں نے انکار کر دیا ۔ ڈاکوؤں نے ہمیں ایک کمرے میں بند کیا اور دوسرے گھر میں ڈاکہ ڈالنے چلے گئے ۔ ڈاکوؤں کے جانے کے بعد ہم نے سکون کا سانس لیا اور سوچا سر سلامت تو پگڑی ہزار ۔ مزید پریشانیوں سے محفوظ رہنے کے لئے ہم نے پولس کو اطلاع نہیں دی ۔"

مثل مشہور ہے چور کا بھائی گرہ کٹ ، ڈاکہ ڈالنا بڑے بھائیوں کا کام ہے ۔ ہمارے شہر میں چھوٹے بھائیوں نے بھی دھوم مچا رکھی ہے ۔ راہ چلتی خواتین کے گلے سے منگل سوتر یا چین اچک لینا ان کا محبوب

مشغلہ ہے ۔ جیب کاٹنا اور منی پرس اڑا لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ۔ حیدر آبادی اپنے آپ کو ان سے بچانے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں ۔ اکثر اشخاص دکھاوے اور دھوکہ دینے کے لئے منی پرس رکھتے ہیں ۔ پیسے چھپانے کے لئے کمربند، بنین، آستین، بلوز اور دوسرے مقامات پر " چور جیب " بنا رکھتے ہیں ۔ اس احتیاط کے باوجود بھی جیب کٹ جاتی ہے ۔ جیب کتروں، اچکوں اور اٹھائی گیروں کی تصاویر پولس کے پاس موجود رہتی ہیں جن کی تشہیر کی جاتی ہے ۔ بعض اوقات چور اچکوں کو ہی فائدہ ہوتا ہے ۔ ایک مرتبہ دوران سفر ایک صورت آشنا اور ہم مل بیٹھے ۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے ۔ ہم سوچتے رہے کہ انہیں کہاں دیکھا تھا ۔ سفر ختم ہونے کے بعد پرس گنوا کر ہمیں یاد آیا کہ اس مہربان کو ہم نے پولس کے البم میں دیکھا تھا ۔

ہمارے دلوں میں ڈاکوؤں اور رہزنوں کی دہشت بیٹھی ہوئی ہے ۔ شفق کی لالی کے ساتھ ہر کوئی اپنے گھر واپس ہونا چاہتا ہے ۔ شہر میں اندھیرا ہونے کے ساتھ خوف وہراس چھا جاتا ہے ۔ اترے چہرے، تیز قدم بڑھاتے نظر آتے ہیں ۔ کون جانے کس گلی سے کوئی شخص نمودار ہو کر نرغے پر چاقو رکھدے اور گھڑی، انگوٹھی اور پیسے لے کر چلتا بنے ۔ حیدر آبادی گھر پہنچ کر اپنی خیریت کا حال سنا کر گھر والوں کی خیریت دریافت کرتے ہیں ۔ کوئی کرنٹ کا بل دینے یا نل کا میٹر دیکھنے کے بہانے گھر آکر کچھ اٹھا تو نہیں لے گیا ۔ ہاتھ دیکھنے یا فال کھولنے والے نجومی نے بے وقوف تو نہیں بنایا ۔ گھر میں تمام بچے موجود ہیں ۔ کوئی غائب تو نہیں ہوا ۔ اطمینان کر لینے کے بعد خدا کا شکر ادا کرتے ہیں " دن خیر سے گذر گیا میرے مولا اب رات بھی تو ہمارا نگہبان رہنا ۔ دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے علیگڈھ کے تالے لگا دیتے ہیں ۔ خود ساختہ بلیک اوٹ لا دیتے ہیں ۔ لاٹھیاں، مرچی کا پاوڈر اور سرچ لائٹ سرہانے رکھ لیتے ہیں ۔ صدر خاندان کے علاوہ کسی اور کو دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں رہتی ہے ۔ ذرا سی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں ۔ ہمارے شہر میں گھوڑے بیچ کر سونے کے دن ختم ہو چکے ہیں ۔ ایک دوست کا خیال ہے کہ جس نے رات میں دروازہ کھولا وہ رستم حیدر آباد ہے اور جناب ایسی بہادری ہر کسی کے نصیب میں نہیں آتی ۔ چند دن قبل رات میں کوئی دو بجے ہمارے گھر دستک ہوئی ۔ ہم ہر دستک پر پہلو بدل کر انجان ہوتے گئے ۔ دیر تک دستک کا سلسلہ بند نہ ہوا تو ہم نے لنگوٹ کس کر لاٹھی اور مرچ کا پاوڈر لئے ، کپکپاتی آواز میں پوچھا " کون ۔ " جواب ملا " میں ہوں ۔ " ہم نے سوال دہرایا پھر وہی جواب ملا ۔ ہم نے سوچا ڈاکو " میں ہوں " ہی کہے گا ۔ وہ یہ تو نہیں بتائے گا کہ میں ڈاکو ہوں، چوری کرنے آیا ہوں ۔ ہم نے ہمت کر کے " جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو " وظیفہ، ورد کرتے ہوئے کہا " دروازہ نہیں کھلے گا ۔ اس گھر میں کچھ بھی نہیں ہے ۔ ڈاکو بھائی کوئی اور گھر ڈھونڈیئے ۔ " اتنا کہہ کر ہم نے دباؤ سے آزاد ہونے بیت الخلاء کا رخ کیا ۔ ایک دو مرتبہ دستک ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی ۔ صبح پتہ چلا کہ دستک دینے والے ہمارے برادر نسبتی تھے جنہوں نے بقیہ رات دروازے کے سامنے اونگھتے کاٹی تھی ۔

مارچ ۱۹۸۴ء

حیدرآبادی قیامت

قیامت اپنے وقت پر آئے گی لیکن وقتاً فوقتاً لوگ اپنے طور پر قیامت لاتے رہتے ہیں ۔ شاعر کے پاس محبوبہ کا حسن ، اس کی بے وفائی اور غریب کے یہاں مہنگائی کے سبب حقیقی قیامت سے پہلے قیامت آتی رہتی ہے ۔ ہم حیدرآبادیوں کے نزدیک بارش ہونا ایک قیامت ہے ۔ دوسرے مقامات پر بارش ایک رحمت ہوتی ہے لیکن ہمارے شہر میں بارش رحمت کی حدود پار کر کے زحمت قرار پاتی ہے ۔ حیدرآبادی سخت گرمی اور تیز دھوپ برداشت کرلے گا لیکن بارش تو کیا بوندا باندی بھی اس سے برداشت ہو نہیں پاتی ۔ ہلکی پھوار شروع ہوتے ہی قیامت آجاتی ہے ۔ شہر میدان حشر کا نمونہ پیش کرنے لگتا ہے ۔ سڑکیں اور کھلی جگہیں ویران ہو جاتی ہیں ۔ ہر کوئی اپنا اثاثہ اٹھائے ، جدھر سینگ سمائے ، چھت کے نیچے سر چھپانے کے لئے بھاگ کھڑا ہوتا ہے ۔ ہمارے خیال میں حیدرآبادی دو مرتبہ بھاگتا ہے ، بس پکڑنے کے لئے اور بارش سے بچنے کے لئے ۔

بارش کے موسم میں چائے زیادہ پی جاتی ہے ۔ سگریٹ پھونکے جاتے ہیں اور ڈاڑھ گرم رکھنے کے لئے پان کھائے جاتے ہیں ۔ لوگ چائے پی کر پان چباتے اور سگریٹ پھونکتے ہوئے بارش رکنے کا انتظار کرتے ہیں ۔ ڈرتے ہوئے اپنی انگلیاں زیر آسمان رکھ کر بارش کا اندازہ کرتے ہیں ۔ پانی کی چند بوندیں پڑنے پر انگلیاں کھینچ کر جیب میں چھپالیتے ہیں ۔ بارش رکنے کے بعد سڑک پر بہتے پانی کا اندازہ لگاتے ہیں کہ کہیں اس میں ڈوب تو نہ جائیں گے ۔ مطمئن ہونے کے بعد اپنے آپ کو اقساط میں باہر نکالا جاتا ہے ۔ پہلے ایک ہاتھ باہر آتا ہے ۔ ہاتھ کے پیچھے شانہ ہوتا ہے ۔ سہما ہوا چہرہ اور گردن کو ہاتھ کے پیچھے ڈھکیلا جاتا ہے ۔ کچھ ہمت بڑھتی ہے تو ایک قدم باہر رکھا جاتا ہے ۔ پھر دوسرے ہاتھ اور پاؤں کو کھلی فضا میں لاکر آسمان کا معائنہ کیا جاتا ہے ۔ موسمی پیش قیاسی کرنے کے بعد ہر طرح سے چوکنے ، اچھلتے ، کودتے اپنی راہ لیتے ہیں ۔

سال میں ایک مرتبہ بارش کا موسم چند دنوں کے لئے آتا ہے ۔ اس کا بھی انحصار مانسون پر ہوتا ہے

مانسون کا ہندوستانی کرکٹ ٹیم کی طرح شاذ و نادر ہی شاندار مظاہرہ ہوتا ہے ۔ ہم حیدرآبادی کبھی کبھار ہونے والی بارش کا بھی لطف نہیں اٹھاتے ۔ بارش میں بھیگنے سے ڈرتے ہیں ۔ سات پردوں میں چھپ کر بیٹھتے ہیں ۔ ہمارے ایک دوست عذر پیش کرتے ہیں "بارش میں بھیگنے سے کپڑے ، بدن اور بال گیلے ہوں گے ۔ ٹھنڈی ہوا لگے گی ۔ سردی زکام ہوگا ۔ ناک اور آنکھوں سے پانی بہے گا ۔ اعضاء شکنی معذور کردے گی ۔ سر میں ناقابل برداشت درد ہوگا ۔ گلے میں خراش ہوگی ۔ کھانسی دن میں چین اور رات میں آرام نہ لینے دے گی ۔ سانس لینے میں دشواری ہوگی ۔ بخار آئے گا ۔ ڈاکٹر کے ناز نخرے اٹھانے پڑیں گے ۔ دواؤں کے لئے روپیہ پیسہ برباد ہوگا ۔ ہو سکتا ہے کہ نمونیا، ڈبل نمونیا، ٹائیفائڈ اور دوسری خطرناک بیماریوں میں گھر کر لقمہ اجل بن جائیں "

بارش میں گھر سے باہر نکلنے کے لئے اہتمام کیا جاتا ہے ۔ اجلے اور اچھے کپڑوں کو چھپادیا جاتا ہے ۔ پھٹے ، پرانے اور بدرنگ کپڑوں کو ترجیح دی جاتی ہے ۔ بارش میں بھیگنے سے بچنے کے لئے برساتی پہنی جاتی ہے ۔ سر کو بھیگنے اور پھسل کر مار لگنے سے محفوظ رکھنے کے لئے ہیلمٹ کا استعمال فائدہ بخش ہوتا ہے ۔ پیروں کو بچانے کے لئے لانگ بوٹ درکار ہوتے ہیں ۔ بارش کی وجہ سے سڑکیں گاؤں کی پگڈنڈیاں بن جاتی ہیں ۔ ان پر چلنے کے لئے ہاتھ میں چھڑی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے ۔ پانی کی بوندیں زمین پر سیدھی نہیں گرتیں ۔ زمین سے پینتالیس ڈگری کا زاویہ بناتی ہیں ۔ پانی کی بوندوں سے چہرے کو بچانے کے لئے چھاتہ ضروری ہوتا ہے ۔ جب ہم اس اہتمام کے ساتھ سڑک پر نکلتے ہیں تو پڑوسیوں کو نیل آرمسٹرانگ کا چاند پر چہل قدمی کرنا یاد آتا ہے ۔ گلی کے کتے بھونکنے لگتے ہیں ۔ بچے الگ پیچھے پڑ جاتے ہیں ۔ دوست احباب پہچانتے نہیں ، بازو سے کترا کر نکل جاتے ہیں ۔

بارش کا منشا سڑکوں کو تباہ کرنا ہوتا ہے ۔ شہر میں بارش کا سارا بوجھ سڑک پر پڑتا ہے اور تباہ و تاراج ہونے کے لئے سڑکیں بھی جیسے منتظر رہتی ہیں ۔ بارش کے پانی سے سڑکیں تحلیل ہوجاتی ہیں اور راستوں کا دھندلا سا نشان باقی رہ جاتا ہے ۔ راستے مخدوش اور پرخطر بن جاتے ہیں ۔ کہیں پتھروں کے ریوڑ کا ٹیلہ تو کہیں گہری کھائی ہوتی ہے ۔ ایک سمت چٹان کھڑی ہے تو دوسری سمت سمنٹ کا سلاب (SLAB) پڑا ہے ۔ غرض سڑک کی شکل بدل جاتی ہے ۔ بارش کے بعد سڑک کے خراب حصوں کی پیوند کاری کے ذریعہ درستگی عمل میں آتی ہے ۔ ہمارے شہر کی سڑکوں پر مختلف قسم اور مختلف طریقوں سے اتنے پیوند لگ چکے ہیں کہ اب سڑکیں کسی بھکاری کی جھولی کی مانند دکھائی دیتی ہیں ۔ تباہ حال اور پیوندی سڑکوں پر موجودہ دور کی سواریاں چل نہیں سکتی ہیں ۔ پیدل چلنا پڑتا ہے یا پھر بیل گاڑی استعمال کرنی پڑتی ہے ۔

مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ بارش دو گھنٹے برستی ہے تو ان کی چھت چار گھنٹے ٹپکتی ہے ۔ کچھ اس سے برا حال ہمارے شہر کی سڑکوں کا ہوتا ہے ۔ بارش دو گھنٹے ہوتی ہے ۔ سڑکوں پر چار دن پانی جمع رہتا ہے اور آئندہ دس دن سڑکیں پانی اگلتی ہیں ۔ سڑکیں تالاب بن جاتی ہیں ۔ ہم نے بچوں کو محلے کے عارضی تالاب میں تیرتے اور مچھلیاں پکڑتے ہوئے دیکھا ہے ۔ سڑکوں کا پانی آس پاس گھروں میں گھس

پڑتا ہے ۔ پیدل راہ گیروں کو اپنا اثاثہ اٹھائے، جوتے ہاتھ میں لیئے، پائنچے چڑھائے پیر گھسیٹتے چلنا پڑتا ہے ۔ موٹروں اور اسکوٹروں کے انجن پانی جانے سے ناکارہ ہوجاتے ہیں ۔ سڑک کے کنارے لوگ اپنی ناکارہ سواریوں کو ٹھیک کرنے کے لئے ان سے ہاتھا پائی کرتے نظر آتے ہیں ۔ جو سواری ٹھیک چلتی ہے وہ سڑک کے تالاب میں کسی نہ کسی گڑھے میں پھنس کر رہ جاتی ہے ۔ ہم نے پچھلی بارش میں شہر کی مشہور شاہراہ پر ایک عجیب و غریب منظر دیکھا تھا ۔ سڑک کے کنارے لوگ جمع تھے ۔ سامنے سے اسکوٹر آئی اور پانی بھرے گڑھے میں گر گئی ۔ لوگ اسکوٹر اور سوار کو اٹھاکر فٹ پاتھ پر رکھنے کے بعد دوسرے شکار کا انتظار کرنے لگے ۔

دیہات میں لوگ آسمان پر بادل دیکھ کر خوش ہوتے ہیں ۔ بارش میں ہنستے، کھیلتے اور بھیگتے ہوئے محنت کرکے اناج اگاتے ہیں ۔ شہر کے لوگ آسمان پر چھائے بادل سے خوف زدہ ہوجاتے ہیں ۔ بارش شروع ہونے سے پہلے ہی محفوظ ٹھکانے تلاش کرلیتے ہیں ۔ بارش سے اناج کے بجائے شہر میں کیچڑ پیدا ہوتا ہے ۔ چہار طرف کیچڑ ہی کیچڑ نظر آتا ہے جبکہ دیہات میں حد نگاہ تک ہریالی بکھری رہتی ہے ۔ سڑکوں اور گلیوں میں کیچڑ پانی کی وجہ سے چلنا پھرنا محال ہوجاتا ہے ۔ کیچڑ میں پتھر رکھ کر راستہ بنانا پڑتا ہے اور ان پتھروں پر اچھلتے کودتے گذرنا پڑتا ہے ۔ راہ گیروں پر کیچڑ ایسے اچھلتا ہے جیسے وہ کیچڑ میں گر کر اٹھے ہوں ۔ ایک مرتبہ سر شام اجلے کپڑے پہن کر ہم گھر سے کچھ دور ہی چلے تھے کہ ایک کار کی مہربانی سے ہم سر سے پیر تک کیچڑ میں نہاگئے اور اس شعر کی تفسیر بن گئے

آنکھوں میں اس کا چہرہ لیئے میں ٹھہر گیا
کیچڑ اڑاتی کار تو اس کی گذر گئی !

دوبارہ انسان بننے کے لئے جب گھر واپس ہوئے تو بچوں اور بچوں کی ماں نے "بھوت ۔ ۔ ۔ بھوت ۔ ۔ ۔ ۔" کا واویلا کرکے ایک کہرام بپا کردیا تھا ۔ بارش رکنے کے بعد کیچڑ سے پانی سوکھ جاتا ہے اور سڑکوں پر مٹی رہ جاتی ہے ۔ ہوا کے ساتھ مٹی آوارہ بادل کی طرح اڑنے لگتی ہے اور راہ گیروں سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی ہے ۔

حیدرآبادی قیامت سے برقی اور ٹیلیفون بھی متاثر ہوتے ہیں ۔ بارش شروع ہوتے ہی برقی آنکھ مچولی کرنے لگتی ہے ۔ کچھ ہی دیر میں وہ تھک کر غائب ہوجاتی ہے ۔ گھر میں گھٹا ٹوپ اندھیرا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے اور باہر موسلا دھار بارش ہوتی رہتی ہے ۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک اور ہواؤں سے ماحول ہندوستانی فلم کا رومانٹک کم سسپنس منظر نظر آنے لگتا ہے ۔ بارش کو دیکھ کر بعض مرتبہ برقی کو بھی پانی کے ساتھ زمین پر بہنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے جو ایک خطرناک صورت حال سے دوچار کردیتی ہے ۔ بارش کے دوران اور بعد میں ٹیلیفون اٹکھیلیاں کرنے لگتا ہے ۔ کال کے بغیر گھنٹی بجتی ہے ۔ ملاتے ایک نمبر ہیں تو کوئی اور ہی نمبر لگتا ہے ۔ شکایت کرنے کے لئے فون ملاتے ہیں تو دوسری جانب سے موسمی پیش قیاسی ہونے لگتی ہے ۔

زندگی کی تیزی اور رنگینیاں بارش کی نذر ہوجاتی ہیں ۔ کئی لوگ اپنے آپ کو گھر میں بند کرلیتے ہیں

تمام کاروبار ٹھپ ہو جاتے ہیں۔ دکان پر گاہکوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ بس اور ریل گاڑی میں کم لوگ سفر کرتے ہیں۔ لگتا ہے شہر میں زندگی بارش کے پانی کی طرح کسی کونے میں جمع ہو گئی ہے۔ اس موسم میں دواخانہ ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں چہل پہل اور رونق عروج پر رہتی ہے۔ جسے دیکھئے اپنا ایک ہاتھ منہ پر اور دوسرا پیٹ پر رکھے ڈاکٹر کے مطب میں بے چین اور مضطرب بیٹھا ہے۔ جو اس مرض سے بچ رہے وہ بخار، کھانسی اور زکام میں مبتلا نظر آتا ہے۔

حیدرآباد شہر میں بارش سال میں تین چار مہینے ہوتی ہے۔ ستمبر کے مہینے نے دھاک جمائی ہے۔ اس مہینے میں یوں تو کئی بار حیدرآبادی قیامت آئی لیکن دو مرتبہ اس نے اپنی ایک تاریخ بنائی ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۰۸ء میں حقیقتاً موسی ندی میں طغیانی آئی تھی اور دوسری مرتبہ ۱۹۷۰ء میں جب ایک افواہ شہر میں پانی لے آئی تھی۔

اگر ہم کہتے ہیں کہ بارش کا موسم حیدرآبادیوں کے لئے ایک قیامت ہے تو کیا غلط کہتے ہیں۔

دسمبر ۱۹۸۳ء

جہ جولوس

ڈر اور خوف انسانی فطرت کا جز ہے ۔ بچے کو ماں مختلف طریقوں سے ڈراتی ہے تاکہ بچہ شرارت سے باز رہے ۔ ہمیں خوب یاد ہے ، والدہ ہمیں "لال بیگ" سے ڈرایا کرتی تھیں جس کا خوف حواسوں پر اتنا چھا گیا ہے کہ آج بھی اندھیرے میں کبھی کبھار لال بیگ نظر آجاتا ہے ۔ جوانی میں بزرگوں کی نصیحتوں اور ڈانٹ ڈپٹ سے ڈر ہوتا ہے ۔ بڑھاپے میں موت کا خوف خدا ترس بنا دیتا ہے ۔ حیدرآبادی خواہ بچہ ہو کہ بوڑھا ، عورت ہو کہ مرد ، تگڑا ہو کہ مریل ، جلوس سے ڈرتا ہے ۔ یہ ایک مشترکہ خوف ہے جو ہر عمر کے حیدرآبادی پر طاری رہتا ہے ۔ پچھلے چند برسوں میں جلوسوں نے وہ تباہی اور غارت گری مچائی ہے کہ آج جلوس کا نام لیتے ہوئے زبان لڑکھڑانے لگتی ہے ۔ لکنت سے جلوس کے بجائے "جہ جولوس" ادا ہوتا ہے ۔ اوسان خطا ہونے لگتے ہیں ۔ سینے میں دل مرغ بسمل کی طرح پھڑپھڑانے لگتا ہے ۔ اب آپ سے کیا چھپائیں مضمون لکھتے ہوئے ہماری حالت غیر ہونے لگی ہے ۔ ہاتھ کپکپاتا اور قلم تھرتھراتا ہے ۔ بار بار پسینہ پونچھتے اور حلق تر کرنے کے لے دو گھونٹ پانی پیتے ہیں ۔

ہمارے شہر میں کئی قسم کے جلوس نکلتے ہیں ۔ مذہبی ، احتجاجی ، سیاسی اور سماجی ، پیدائش پر جھولے کا جلوس نکالا جاتا ہے ۔ شادی کے موقع پر بارات کا جلوس اور مرنے کے بعد آخری سفر کے جلوس کا اہتمام کیا جاتا ہے ۔ لیڈر کا استقبال جلوس نکال کر کیا جاتا ہے تو تہنیت بھی جلوس نکال کر پیش کی جاتی ہے ۔ آج کے دور میں ہر مسئلہ کا حل احتجاج ہے اور احتجاج جلوس کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ احتجاجی جلوس دلچسپ ہوتے ہیں ۔ کبھی کسی گدھے کو جلوس کی قیادت دی جاتی ہے تو کسی جلوس میں جلوسی ڈھاٹے باندھ کر چلتے ہیں ۔ جلوس کی وجوہات کی فہرست شیطان کی آنت کی طرح لانبی ہے ۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ جلوسوں کی بہتات کے لیے ہمارے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی ، بے کاری اور بے روزگاری ذمہ دار ہے ۔ لوگوں کو اکٹھا کرنے کی بھی ضرورت نہیں ، کہیں دو چار آدمی جمع ہوں تو خود بخود اجتماع بھیڑ کی شکل اختیار

کرلیتا ہے۔

ہمارے شہر میں مختلف قسم کے جلوسوں کا اختتام یا انجام ایک جیسا ہوتا ہے ۔ ہر جلوس تباہی مچاتا ہے جس کی وجہ سے شہریوں کے دل و دماغ پر جلوس کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے ۔ کسی وقت کہیں بھی چار اشخاص زندہ باد ، مردہ باد کے نعرے لگاتے سڑک پر آجائیں تو قیامت آجاتی ہے ۔ آناً فاناً دکانیں بند ہوجاتی ہیں ۔ لوگوں کے دل دہل جاتے ہیں اور وہ گھر میں گھس کر اپنے آپ کو محفوظ کرلیتے ہیں ۔ سڑکیں ، سنسان ہوجاتی ہیں ۔

جلوس یوں ہی نہیں نکل پڑتا ۔ باضابطہ پروگرام بنتا ہے ۔ جلوس نکالنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جاتی ہے ۔ جلوس نکلنے کا ایک دن مقرر ہوتا ہے ۔ پولس سے اجازت لینی پڑتی ہے ۔ اگر اجازت نہ ملے تو کوئی مضائقہ نہیں ، جلوس بغیر اجازت نکل پڑتا ہے ۔ جلوس کے پروگرام کے ساتھ امن پسند شہریوں کی پریشانی شروع ہوجاتی ہے ۔ دعاؤں کے لئے ہاتھ اٹھ جاتے ہیں "مولا ۔ تو اپنی رحمت سے جلوس کا دن پر امن گذار دے ۔ " جلوس گزرنے کے راستے سے لوگ اپنا سامان ہٹالیتے ہیں اور محفوظ مقام کی طرف کوچ کرتے ہیں ۔ جلوس کمیٹی کی جانب سے جلوس کے راستے کا تعین کیا جاتا ہے ۔ راستے کے دونوں جانب جھنڈیاں لگتی ہیں برقی قمقمے لگائے جاتے ہیں ۔ جلوس کے خیر مقدم کے لئے کمانیں اور اسٹیج بنائے جاتے ہیں ۔ نئے نعرے ایجاد کیے جاتے ہیں ۔ پلے کارڈس اور بیانرس تیار ہوتے ہیں ۔ جلوس کے راستے میں تازہ دم ہونے کے لئے پانی اور ناشتے کا انتظام کیا جاتا ہے ۔ دھوپ سے بچنے کے لئے ٹوپیاں فراہم کی جاتی ہیں ۔ جلوس کے لئے تیاریوں کو دیکھ کر ہمارا بلڈ پریشر بڑھنے اور اختلاج ہونے لگتا ہے ۔

جلوس کے دن ہمارے شہر میں چھٹی دے دی جاتی ہے ۔ اسکول ، کالج اور دفاتر بند ہوتے ہیں ۔ اگر چھٹی نہ ہوئی تو خود عوام کام سے غائب رہتے ہیں ، بازار تو پہلے ہی سے بند رہتے ہیں ۔ اثاثے کی تباہی کا خدشہ لگا رہتا ہے ۔ گڑبڑ ہونے اور کرفیو نافذ ہونے کی فکر دامن گیر رہتی ہے ۔ مائیں بچوں کو سینے سے لگائے رکھتی ہیں ۔ بیوی شوہر کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے ۔ گھر سے باہر نہ جانے کے لئے منت سماجت کرتی ہے ۔ ہماری بیوی سال بھر حکم چلاتی ہیں لیکن جلوس کے دن وہ ہماری خوشامد کرتی اور دامن پھیلا کر سہاگ کی بھیک مانگتی ہیں ۔

مقررہ دن شہر کے مختلف گلی کوچوں سے چھوٹے چھوٹے جلوس نکلتے ہیں جو ایک مرکزی جلوس میں ضم ہوجاتے ہیں ۔ اکثر جلوسوں کی قیادت بینڈ پارٹیاں کرتی ہیں ۔ یہ بھی ہمارے شہر کے جلوسوں کی انفرادیت ہے ۔ پلے کارڈس لئے ، بیانرس اٹھائے اور نعرے لگاتا جلوس رینگنے لگتا ہے ۔ کبھی باجہ بجانے پر اعتراض ہوتا ہے تو کبھی کسی سمت سے پتھراؤ کی شکایت کی جاتی ہے اور پھر فساد بپا ہوتا ہے ۔ جلوسی بپھر جاتے ہیں ۔ جانے کہاں سے جلوسیوں کے ہاتھ لاٹھی ، پتھر ، ہتھیار اور پیٹرول لگ جاتا ہے ۔ چاقو زنی ، لوٹ مار ، پتھراؤ اور آتشزنی کا لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے ۔

جلوس اور جلوسیوں کے راستے میں جو بھی آتا ہے اس کی خیر نہیں رہتی ۔ دکانوں کو " سنگسار " کیا

جاتا ہے ۔ سواریوں کو جلایا جاتا ہے ۔ اور لوگوں کو مارا پیٹا جاتا ہے ۔ حادثات سے محفوظ رہنے کے لئے دکاندار اپنی دکان مضبوط بنالیتے ہیں ۔ عوام جلوس کے راستے سے گزرتے ہوئے کتراتے ہیں ۔ حکام احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہیں ۔ راستے کے اطراف پولس رہتی ہے ۔ جلوسیوں کی حرکت پر نظر رکھنے کے لئے چھتوں کو واچ ٹاور بناتے ہیں ۔ فضا میں ہیلی کاپٹر چکر لگاتا رہتا ہے ۔ طبی امداد مہیا کرنے اور آگ فرو کرنے کے لئے عملہ تیار رہتا ہے ۔ پرامن واپس ہونے کے لئے جلوسیوں کو سواریاں مہیا کی جاتی ہیں ۔ شہر کے دوسرے مقامات پر بھی زبردست بندوبست کیا جاتا ہے ۔ تمام تر احتیاطی تدابیر کے باوجود گڑبڑ ہوتی ہے ۔ اسی لئے امن پسند شہری جلوس پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ ہم سے اگر پوچھا جائے تو ہم کہیں گے کہ جلوس نکالنا ہمارا جمہوری حق ہے ۔ اس سے محروم نہ رکھا جائے ۔ جلوس کو شہر میں ممنوع کردیا جائے اور جلوس نکالنے کے لئے شہر سے باہر ایک راستہ مقرر کیا جائے ۔ راستے میں ڈمی دکانیں ، مکانات اور گاڑیاں رکھی جائیں تاکہ جلوسی اپنی بھڑاس نکال سکیں ۔ اس سڑک پر صرف جلوس نکالے جائیں اور سڑک کا نام " جلوس روڈ " رکھا جائے ۔ جلوس روڈ کا اختتام " جلسہ میدان " پر ہو جہاں پر جلسے منعقد کئے جائیں ۔

جلوس اور جلسے میں چولی دامن کا رشتہ ہے ۔ یہ رشتہ دو قسم کا ہوتا ہے ۔ " جلوس برائے جلسہ " پہلے جلوس نکلتا ہے پھر جلسہ منعقد کیا جاتا ہے تاکہ لوگ جلوس میں دھوم مچا کر تھک کر جلسہ گاہ میں آرام کریں ۔ " جلسہ برائے جلوس " جلسہ کے بعد جلوس نکلتا ہے ۔ اس جلوس میں جلوسی تازہ دم نہیں رہتے اور آدھے سے زائد لوگ جلسے کے بعد گھر لوٹ جاتے ہیں ۔ بقیہ آدھے لوگ تھکے ماندے بوجھل قدموں سے بے دم جلوس نکالتے ہیں ۔ جلوس برائے جلسہ کو فوقیت دی جاتی ہے ۔ ہمارے شہر میں جلوس اور جلسے جشن کی صورت بھی اختیار کرلیتے ہیں ۔ کئی دن ایک مقام پر کیمپ لگادیا جاتا ہے ۔ مختلف مقامات سے جلوس پہنچتے ہیں ۔ جلسے منعقد ہوتے ہیں ۔ گھنٹوں کے حساب سے لوگ بھوکے بھی رہتے ہیں ، چھ گھنٹے ، بارہ گھنٹے اور چوبیس گھنٹوں کی علامتی بھوک ہڑتال ۔ اس قسم کے کیمپ ہمارے شہر میں ہر موسم میں ہر وقت کہیں نہ کہیں نظر آتے ہیں ۔

کہتے ہیں شیر کو پکڑنا آسان ہے لیکن اسے پالنا بہت مشکل کام ہے ۔ یہی کہاوت جلوس پر بھی صادق آتی ہے ۔ لوگوں کو جمع کرنا اور جلوس نکالنا سہل ہے لیکن جلوس اور جلوسیوں پر قابو رکھنا کسی کے بس کا روگ نہیں ہے ۔ جب یہی بات ہم نے اپنے ایک دوست سے کہی تو انہوں نے ناگواری سے کہا " کون کم بخت جلوس پر کنٹرول کرنا چاہتا ہے ۔ جلوس نکالا اسی لئے جاتا ہے کہ شیر تمہیں اور ہمیں چیرپھاڑ کر کھا جائے اور چوطرف تباہی مچائے " ۔

ہمارے شہر میں لیڈر اپنی طاقت کا مظاہرہ جلوس نکال کر کرتے ہیں ۔ مرضی کے خلاف بات ہوئی کہ لیڈر نے جلوس کی دھمکی دی ۔ جمہوریت میں جو زیادہ مجمع لگا پاتا ہے وہی بڑا لیڈر ہوتا ہے ۔ لیڈر اپنے مخالف سے مقابلے کے لئے نت نئے جلوس نکالتے ہیں ۔ ہمارے شہر میں بعض لیڈر ہیں جو جلوس نکالنے کے اکسپرٹ تصور کئے جاتے ہیں ۔

کسی زمانے میں جب جلوس نکلتا تھا تو لوگ جوق در جوق سڑک کے کنارے جمع ہو کر نظارہ کرتے تھے ۔ جلوس کے ساتھ چلتی پھرتی دکانیں ہوتی تھیں ۔ تماشائی جلوس سے محظوظ ہوتے ہوئے شاپنگ کرتے تھے ۔ لیکن آج جلوس کا تماشہ صرف پولس دیکھتی ہے ۔ عوام جلوس کے دن گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرتے ۔ پولس بہتر تماشائی ثابت ہوئی ہے ۔ اس کے سامنے جلوسی توڑ پھوڑ مچاتے اور وہ خاموش رہتی ہیں ۔

ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے

بعض مرتبہ تماشے سے بے زار ہو کر پولس موقع سے غائب بھی ہو جاتی ہے ۔ پتہ نہیں اس طرح جلوسیوں سے اتفاق کا مظاہرہ کیا جاتا ہے یا پھر اپنی بے بسی کا بہ بانگ دہل اعتراف ۔

ستمبر ۔ ۱۹۸۵ء

باہر کا جادو

پچھلے بیس پچیس سال سے حیدرآبادی پیسہ کمانے کے لئے غیر ممالک بالخصوص خلیج کا رخ کر رہے ہیں ۔ غیر ممالک کا سفر اتنا عام اور آسان ہو گیا ہے کہ اب سمندر پار سفر کو "باہر جانا" کہنے لگے ہیں جیسے کوئی گھر سے باہر نکڑ کی دکان سے سگریٹ لانے جا رہا ہو ۔ ہمارے ایک دوست پندرہ دن بعد ملے ۔ ہم نے غیر حاضری کا سبب دریافت کیا ۔ انہوں نے جواب دیا "ذرا باہر گیا تھا ۔" ہم نے قیاس کیا کہ وہ پٹن چرو یا یادگیر گنڈ گئے ہوں گے لیکن موصوف نے وضاحت کر کے ہمیں حیرت زدہ کر دیا کہ وہ نوکری کی تلاش میں مسقط گئے تھے ۔

باہر جانے کی وباء سے ہر کوئی متاثر ہے خواہ وہ مزدور پیشہ ہو کہ سخنور و دانشور ۔ چند حیدرآبادی دولت جمع کر کے وطن واپس آچکے ہیں ۔ بہت سارے ابھی باہر ہیں ۔ کئی لوگ آ اور جا رہے ہیں ۔ بقیہ حیدرآبادی جو باہر نہیں گئے "اندر" ہیں، ان کے دل میں باہر جانے کا ارمان ہے ۔ پڑھ لکھ کر انجینئیر یا ڈاکٹر بننے کے بجائے نئی نسل کی پہلی اور آخری خواہش ہے کہ وہ جلد از جلد بالغ ہوں، پاسپورٹ بنوائیں اور پیسہ کمانے کے لئے باہر کا رخ کریں ۔ باہر جانے والوں اور باہر جانے کا ارمان رکھنے والوں کو دیکھ کر اکثر ہمیں محسوس ہوتا ہے جیسے اب دیار وطن میں جینے کا مزا نہیں رہا ۔ زندگی گذارنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لئے وطن سے کوچ کرنا ضروری ہے ۔ وطن کی آب و ہوا صرف پیدائش کے لئے موافق ہے چنانچہ دنیا کا ہر چھٹا شخص ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے ۔

بچپن میں ہم نے "الہ دین کا چراغ" نامی و گرامی کہانی پڑھی تھی ۔ اٹھتے بیٹھتے ہم نے جادوئی چراغ کی تمنا بھی کی تھی ۔ ایک دن ہمارے پاس چاکلیٹ خریدنے کے لئے پیسے نہ تھے تو ہم نے بارگاہ الہیٰ میں گڑگڑا کر الہ دین کے چراغ کے لئے دعا مانگی تھی ۔ چند سال قبل اس کہانی جیسا واقعہ دیکھ کر ہم ایمان لے آئے کہ بعض کہانیاں سچ بھی ہوتی ہیں ۔ ہمارے پڑوس میں ایک لڑکا رہتا ہے ۔ اس کے والد درزی تھے اور ان کا

انتقال لڑکے کی اوائل عمری میں ہوا۔ ماں نے محنت کر کے لڑکے کو پالا اور پوسا۔ لڑکا ضدی تھا۔ تعلیم حاصل نہ کرسکا۔ بے دلی سے بجلی کا کام سیکھا۔ محلے میں کسی کے گھر بجلی غائب ہونے پر فیوز ڈالنے گیا۔ وہاں لڑکے کی ملاقات گھر کے امپورٹیڈ داماد سے ہوئی۔ شیخ صاحب افریقی ساحر کی طرح لڑکے کو اپنے ساتھ باہر لے گئے۔ چند مہینوں میں اس کی جھونپڑی، عالیشان سہ منزلہ عمارت میں تبدیل ہو گئی۔ خدمت کے لئے خادم مامور ہوئے۔ گھر میں آرام و آسائش کی تمام چیزیں اکٹھا ہوئیں۔ جب بھی لڑکا باہر سے آتا محلے میں گویا جشن ہوتا۔ دوست احباب کو تحفے تحائف ملتے۔ ایک دن لڑکے نے گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو کر محلہ کے رئیس اعظم کی حسین و جمیل لڑکی کا دیدار کیا۔ اس سے نکاح کا ارمان کیا۔ باہر کے جادو کی مدد سے ڈھیر سارے، کپڑے، مٹھائی اور زیور کے ساتھ اپنا پیغام بھجوایا۔ رئیس اعظم نے لڑکے کو اپنی فرزندی میں قبول کرلیا۔ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ گئے اور جلنے والے جل گئے۔ دونوں ہنسی خوشی زندگی گذار رہے ہیں

ایک صاحب کی شادی اس شرط پر ہوئی کہ سسرال والے انہیں باہر بھجوائیں گے۔ سو انہیں باہر اسمگل کیا گیا۔ گویا جادوئی چراغ ہاتھ آیا۔ بہترین فرنیچر اور دیگر ضروریات زندگی سے آراستہ گھر بنوالیا۔ صاحب جائیداد بن بیٹھے۔ بینک میں پیسہ جمع کیا اور پھر اپنی مرضی اور پسند سے دوسری شادی کی۔ اب دو بیویوں کے اکلوتے شوہر بنے عیش کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے بتلایا "میرے ڈرائیور کے ہاتھ جادوئی چراغ لگا ہے۔ باہر جانے سے پہلے وہ مجھ سے بخشش اور انعام وصول کیا کرتا تھا اور اب جب وہ باہر سے آتا ہے تو مجھے یہ کہہ کر نوازتا ہے کہ صاحب آپ نے برے وقت میری مدد کی تھی۔ " ایک دو واقعات ہوں تو انہیں قلمبند کیا جائے۔ ہمارے شہر میں ہر دن ایسے کئی واقعات ہوتے رہتے ہیں جنہیں ہم اندر والے ایک دوسرے کو سناتے اور ڈھارس بندھاتے رہتے ہیں۔ "صبر کرو میاں، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

ہمارے شہر کے معاشی اور سماجی حالات اس قدر سنگین ہو چکے ہیں کہ اگر آپ باہر نہ جانا چاہیں تو بھی آپ کو باہر بھیجنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ روکھی سوکھی کھا کر گذارنا چاہیں تب بھی ہاتھ میں پاسپورٹ اور گلے میں ویزا ڈال کر باہر ڈھکیلا جاتا ہے۔ لڑکے تو خیر لڑکے ہیں انہیں کمانے سمندر پار جانا چاہئیے لیکن ہمارے شہر میں لڑکیوں کا نکاح کر کے باہر وداع کیا جاتا ہے۔ لڑکی کے ہاتھ میں چراغ کے بجائے خود بوڑھا جن رہتا ہے۔ سنتے ہیں کہ ایک جن پر چار حاکم بھی وارد رہتے ہیں۔ بوڑھے جن ہمارے شہر کی لڑکیوں کی ناز برداری کرتے ہیں۔ انہیں اور ان کے خاندان کو خوش و خرم رکھتے ہیں۔ جب یہی لڑکیاں اپنے ہم وطنوں سے ملنے آتی ہیں تو پہچاننے میں تکلف ہوتا ہے۔ کیا یہ وہی لڑکی ہے جو باہر جانے سے پہلے کالی پیلی، دبلی پتلی اور نحیف و ناتواں تھی اور اب ایسا حسن نکھر آیا کہ آس پاس کے نوجوان ٹھنڈی آہ بھر کر صبر کر لیتے ہیں۔

باہر نہ جانے والے اڑیل شہریوں کو مختلف طریقوں سے سمجھایا اور منایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

ایک فرد کے دور ہونے سے گھر کے دوسرے افراد مزے میں رہ سکتے ہیں ۔ بہنوں کی شادیاں ہو سکتی ہیں ۔ والدین کا قرضہ چکایا جاسکتا ہے ۔ صاحب جائیداد بن سکتے ہیں ۔ بچوں کو اچھے اسکول میں تعلیم دلوا سکتے ہیں ۔ اپنوں کے لئے کیا اتنی قربانی نہیں دی جاسکتی ۔ دیار غیر میں کئی ہم وطن مل جاتے ہیں ۔ اپنوں کو بھی بلالینا ۔ ہمارے خطوط اور کیسٹ آتے رہیں گے ۔ دوست احباب سے خیر خیریت معلوم ہوتی رہے گی ۔ کھانے اور پہننے کو اچھا ملے گا ۔ ویڈیو پر ہندوستانی فلمیں اور پاکستانی ڈرامے دیکھ سکتے ہیں ۔ تنہائی میں مہدی حسن اور منی بیگم کی غزلیات سن سکتے ہیں ۔ اچھے اور نیک بندوں کی طرح دوسروں کی خاطر اپنا آرام تج دو ۔ اب آپ سے کیا چھپائیں ۔ ہماری بیوی نے ایک مرتبہ ہم سے کہا تھا "آپ میں اور مجھ میں چھ بچوں کا فاصلہ ہے ۔ میں گھر گرہستی کے جھمیلوں میں الجھی رہتی ہوں اور آپ گھر کی چکی چلانے کے لئے دن رات محنت کرتے رہتے ہیں ۔ بہتر ہے کہ آپ باہر جائیں اور چار پیسے کما کر لائیں ۔ بچے سیانے ہو گئے ہیں ۔ وہ بھی پوچھتے ہیں کہ آپ باہر کیوں نہیں گئے ۔ پپو مجھ پر طنز کر رہا تھا کہ میں نے آپ کو جانے نہ دیا ہو گا " ۔ مختلف طریقوں سے سمجھانے اور منانے سے کام نہ بننے پر غیرت کو للکارا جاتا ہے ۔ ہم نے ایک بیوی کو کہتے سنا "آپ پڑھے لکھے ہیں تو کیا ہوا ۔ ہمیں بڑے بڑے انگریزی میں باتیں بناتے رہتے ہیں ۔ آپ سے تو رضیہ کا ان پڑھ ڈرائیور شوہر اچھا ہے ۔ باہر جا کر زیور اور کپڑے بھیجتا رہتا ہے ۔" ہمارے ایک ساتھی ادیب کی بیوی نے طعنہ دیا ۔ آپ ہمیں بیٹھے کاغذ کالا کرتے رہئیے ۔ ہماری ماما تک شیخ کے بچوں کو سنبھالنے باہر جا چکی ہے ۔ " ایسے ناگفتہ بہ حالات میں اندر رہنے والا بے چارہ صبر نہ کرے تو کیا کرے ۔

یہ بات نہیں کہ اندر والے باہر جانا نہیں چاہتے ۔ باہر جانے کے لئے لاکھ جتن کئے جاتے ہیں لیکن بات نہیں بنتی ۔ ہم ایک صاحب کو جانتے ہیں جو ہر فن مولا ہیں ۔ باہر جانے کے لئے انہوں نے ڈرائیونگ سیکھی ۔ گریجویٹ تو تھے ہی ٹائپ کرنا بھی سیکھا ۔ شارٹ ہینڈ میں مہارت حاصل کی ۔ ایک مرتبہ باہر کے لیے الیکٹریشن درکار تھے ، سو بجلی کا کام سیکھ لیا ۔ ٹی وی اور فریج میکانک بھی بنے ۔ ان کے دوست نے بلوانے کے لیے انہیں ڈرافٹسمین بنایا ۔ ایک اور مرتبہ وقت کی تنگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کمپاونڈر کا جعلی سرٹیفکٹ لیا ۔ ہر مرتبہ کسی نہ کسی حیثیت سے باہر جانے کی کوشش کی لیکن ان کی قسمت میں باہر جانا نہیں لکھا تھا اور نہ ہی وہ باہر گئے ۔

باہر روزگار کے مواقع دستیاب ہونے کے ساتھ ہی ہمارے سماج میں ایک نئی قسم کی پود پیدا ہوئی جسے رکروٹنگ ایجنٹس کہتے ہیں ۔ گلی گلی باہر بھیجنے والوں کے دفتر کھل گئے ۔ اخباروں میں ان کی جانب سے اشتہارات چھپتے ہیں ۔ اشتہارات میں باہر جانے والے خوش نصیبوں کی تصویریں چھپتی ہیں ۔ چند دن زور و شور سے کام کرنے اور مختلف لوگوں کو اپنے اطراف پھرانے اور پیسہ بٹورنے کے بعد رکروٹنگ ایجنٹس خود گول ہو جاتے ہیں ۔ اخبار میں اشتہار کی جگہ جھانسہ دے کر لوٹنے والوں کی گرفتاری کی خبر چھپتی ہے ۔ آس کے مارے ، باہر جانے کی آرزو میں کئی شہری اندر ہی لٹ گئے ۔ ہم ایسے لوگوں کے لئے ماتم نہ کریں تو اور کیا کریں ۔

باہر جانے کی وبا کے ساتھ ہمارے شہر میں موقتی فنی اور تعلیمی ادارے بھی اگ آئے ہیں ۔ جلد کمانے کے قابل بنانے کے لئے نوجوانوں کو مختلف سانچوں میں ڈھالتے جارہے ہیں ۔ پیسے دیجئے اور ہفتوں بلکہ دنوں میں جو طبیعت چاہے بن جائیے ۔ ایک ایسے ہی ادارے نے ہمارے دوست کو صرف چھ ہفتوں میں ڈاکٹر بنایا ۔ باہر جانے کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں تو انہوں نے اندر ہی مطب لگانا شروع کر دیا ۔ کلینک پر باہر سے آنے والے بوڑھوں کا مجمع لگا رہتا ہے ۔ وہ قوت باہ کے لئے شرطیہ دوا دیتے ہیں ۔

باہر جاکر آنے والے حضرات ، تنہائی اور باہر کی مشکلات کا رونا روتے ہیں ۔ کہتے ہیں پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہے ۔ اندر والوں کو ایک گونہ سکون ملتا ہے کہ اچھا ہوا ہم باہر نہیں گئے ۔ اس کے برخلاف باہر والوں کے اہل و عیال سال کے بارہ مہینے اپنی امارت سے اندر والوں کے سینے پر مونگ دلتے ہیں ۔ ہم ایک صاحب سے واقف ہیں جن کے سبھی بچے باہر ہیں ۔ بوڑھا اور بڑھیا دوائیاں کھاتے سامان کی حفاظت کرتے رہتے ہیں ۔ بچوں کے باہر سے اندر آکر جانے کے بعد دوست احباب کو گھر بلاکر باہر سے آئی ہوئی چیزیں دکھاتے ہیں ۔ ایک مرتبہ ہم بھی ان کے مہمان بنے ۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا ۔ قالین اور پردے باہر کے تھے ۔ دیواری گھڑی باہر کی تھی ۔ وقت بتلانے کے لئے کانٹے پھرتے اور بند سے بھی نمودار ہوتے تھے ۔ گھنٹے بجتے اور میٹھی اور سریلی آواز میں وقت بھی سنایا جاتا تھا ۔ ایک اسٹریوفونک ٹیپ اور ریڈیو بھی تھا ۔ گانے والی کی آواز چاہیئے ، آواز سنیئے ، موسیقی چاہیئے تو گانے والے کی آواز نہیں سنائی دے گی ، صرف موسیقی نشر ہوتی رہے گی ۔ سب کو سنایئے یا کان میں بٹن لگاکر خود اکیلے سنیئے ۔ کلر ٹی وی اور ویڈیو ساتھ میں ڈھیر ساری فلموں کے کیسٹ ۔ کیمرہ ۔ کھلونے ۔ پن ۔ ہاتھ کی گھڑیاں ۔ کپڑے وغیرہ وغیرہ ۔ ہماری تواضع باہر سے لائے ہوئے سوکھے میوؤں اور تازہ کھجور سے کی گئی ۔ ظاہر ہے برتن بھی باہر ہی کے تھے ۔ چائے اس ریمارک کے ساتھ پیش ہوئی کہ یہ ہے تو ہندوستانی لیکن ایکسپورٹ کوالٹی ہے ۔ صرف باہر ملتی ہے ۔ اندر ملاوٹ شدہ چائے دستیاب ہے ۔ صاحب خانہ کی مہربانی کہ انہوں نے تمام اشیاء کی نمائش بلاٹکٹ کی ۔

باہر جاکر آنے والوں کی قابل رشک حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ باہر صحت اچھی رہتی ہے ۔ ہم نے مستقل دائمی بیماری سے چھٹکارا پانے کے لئے باہر جانا چاہا تھا ۔ ڈاکٹر کا مشورہ بھی یہی تھا ۔ " اچھا کھائیے اور تفکرات سے دور رہیئے ۔ اندر یہ دونوں باتیں آپ کی پہنچ سے باہر ہیں ۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ باہر چلے جائیں ۔ " ڈاکٹر کا مشورہ سن کر ہمیں مرض دق کی یاد آئی جس کے علاج کے لئے مریضوں کو اچھی غذا اور آرام وہ ، صاف ستھرا ماحول فراہم کرنے کے لئے شہر سے دور پر فضا پہاڑی مقام پر بھیجا جاتا ہے ۔ ہم نے جھجکتے ہوئے ڈاکٹر سے دریافت کیا " خدانخواستہ ہمیں مرض دق تو نہیں ہے ۔ " ڈاکٹر نے جواب دیا " اب تو نہیں ہے ۔ اگر اندر کے حالات ایسے ہی برقرار رہے تو ایک نہ ایک دن ضرور ہو جائے گا ۔ "

لوگ کہتے ہیں کہ باہر جاکر پیسہ کمانے سے زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے ۔ زرمبادلہ سے اندر والوں کا بھی فائدہ ہوتا ہے ۔ ہمیں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی ۔ اس کے برخلاف باہر جانے کی وبا کے بعد سے اندر مہنگائی میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوئی ہے ۔ باہر والوں کی قوت خرید بڑھتی گئی اور اندر والوں کی

قوت خرید کم سے کم تر ہوتی گئی۔ بازار میں اندر والے کسی شئے کا بھاؤ تاؤ کرتے رہتے ہیں کہ باہر والے اسی چیز کو منہہ مانگے دام ادا کر کے خرید لے جاتے ہیں۔ تب دکاندار اندر والوں سے آگے بڑھنے کے لئے کہتا ہے اور بے چارے اندر والے صبر کے دو گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی سے اندر والے زندہ رہنے کے لئے غذا اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا بمشکل بہتیا لیتے ہیں۔ رہنے کے لئے مکان کا صرف ارمان رکھتے ہیں۔ باہر والوں کے مکان میں کرائے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ بعض وقت اندر والوں کی مکانی تنگدستی کے لئے ظفر کا مصرعہ گنگنانا پڑتا ہے

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں۔

جون۔ ۱۹۸۶ء

پاشو باہر سے آیا

حیدر آبادیوں کے غول کے غول مشرق وسطیٰ کوچ کر گئے ۔ حساب کتاب رکھنے والے ماہرین کے مطابق ہمارے شہر کے ہر گھر سے کوئی نہ کوئی فرد باہر ضرور ہے ۔ جسے پوچھئے ، وہ باہر ہے ۔ شہر میں خود شہریوں کا کال پڑا ہوا ہے ۔ پچھلے دنوں ہمیں ایک بڑھئی کی ضرورت درپیش تھی ۔ بہت تلاش کیا لیکن ڈھنگ کا بڑھئی ہاتھ نہ آیا ۔ ایک بزرگ نے ہمیں پر خلوص مشورہ دیا "میاں دبئی چلے جاؤ ۔ وہاں کام مانگتے ہوئے کئی بڑھئی مل جائیں گے ۔ "مشورے پر عمل کرتے ہوئے ہم باہر جاکر اپنوں کے ناز اٹھانے سے قاصر ہیں ۔ لیکن یہیں رہ کر باہر سے آنے والے ہم وطنوں کو بھگت رہے ہیں ۔

باہر کی ہوا کھاکر آنے والا آسانی سے پہچانا جاتا ہے ۔ دور ہی سے وہ اپنی موجودگی کا پتہ دیتا ہے ۔ اگر آپ کی ناک سینٹ کی تیز بو سونگھنے لگے تو یقین کرلیجئے کہ باہر سے آیا حیدر آبادی کہیں آس پاس ہے ۔ ہم سینٹ کی بو کو " اپنائیت کی خوشبو " قرار دینے لگے ہیں ۔ اپنائیت کی خوشبو اتنی تیز آتی ہے کہ بعض اوقات اپنوں کو زکام ہوتا ہے اور غیروں کو سینٹ میں غسل کرنے کا گمان گذرتا ہے ۔ دور سے اپنی آمد کا پتہ دینے کے علاوہ باہر سے آنے والے ہم وطن کا منفرد حلیہ ہوتا ہے ، جو چیخ چیخ کر اعلان کرتا ہے " میں باہر سے آیا ہوں ۔ " سفاری سوٹ جو موٹے جسم پر منڈھا جاتا ہے ۔ اوپر کے بٹن کھلے ہوئے جس میں سے سونے کی زنجیر جھانکتی رہتی ہے ۔ کلائی پر ڈھیلی ڈھالی جھولتی ہوئی گھڑا نما گھڑی ، انگلیوں میں انگوٹھیاں ، ایک ہاتھ میں باہر کے سگریٹ کی ڈبیہ اور لائٹر تو دوسرے ہاتھ میں سینٹ میں تربہ تر دستی اور پیروں میں اونچی ایڑی کی چپل یا جوتا ۔ ۔ ۔ ۔ اس حلیہ میں کوئی نظر آئے تو ایمان لے آیئے کہ یہ شخص باہر سے آیا ہے ۔

باہر سے آنے والے شہری کا استقبال دھوم دھام سے کیا جاتا ہے ۔ دوست احباب اور رشتہ دار جمع ہوتے ہیں ۔ ایرپورٹ جاتے ہیں ۔ بینڈ باجے کا انتظام ہوتا ہے ۔ آنے والے سے گلے ملتے ہیں لیکن نظریں بیگج کا طواف کرتی رہتی ہیں ۔ خیریت دریافت کرنا چھوڑ کر سوالات کرتے ہیں ۔ " اجی ۔ میرے لئے سونے کا

بسکٹ لائے ہونا" ۔ " بیٹا میرے لئے بلڈ پریشر کا پیڈ لائے ہو ۔ " " بھیا ۔ میرا میک اپ کا سامان " ۔ " بھائی جان ۔ میری سیکو گھڑی " ۔ " ڈیڈی بولتی گڑیا کہاں ہے ۔ " " انکل اسکوٹر بک کرنے کے لئے ڈرافٹ اس مرتبہ تو نہیں بھولے " ۔ " یار ۔ میرا ویزا ۔ " آنے والا شہری سوالوں کے جوابات دیتا ہے ۔ جب اسے سانس لینے کی فرصت نصیب ہوتی ہے تو وہ اپنوں کی خیریت دریافت کرنے لگتا ہے ۔ " ماموں کا انتقال کیوں کر ہوا " " ابو ۔ آپ دوائیں پابندی سے استعمال کر رہے ہیں یا اپنی صحت سے لاپرواہی برت رہے ہیں " ۔ " دادی ماں آپ کے لئے زیتون کا تیل بھجوایا تھا اور اب بادام لایا ہوں ۔ حریرہ بنا کر استعمال کیجئے " ۔ " اچھا منی کا یہ چوتھا لڑکا ہے ۔ " " بڑی بی ابھی بقید حیات ہیں " اور یہ سوال کرنا کوئی بھولتا ہی نہیں " شہر کے حالات کیسے ہیں ۔ کیا اب بھی خون رائیگاں بہتا ہے ؟ "

باہر کے آب و دانہ میں معلوم نہیں کیا تاثیر ہے ، جو شہری باہر جانے سے پہلے سوکھے ساکھے چھوارے جیسے تھے واپس تر و تازہ ہو کر آتے ہیں ۔ جو موٹے تھے وہ مزید پھول جاتے ہیں ۔ جسم جگہ جگہ سے پھول کر غبارہ ہو جاتا ہے ۔ رنگ نکھر آتا ہے ۔ چہرہ پر کشش ہو جاتا ہے ۔ لگتا ہے اندر خزاں تھی تو باہر بہار آئی ہوئی ہے ۔ ہیت بدل جانے اور ایک طویل عرصہ تک باہر رہنے کی وجہ سے پہچان مشکل ہوتی ہے ۔ گھر واپس آنے کے بعد رشتہ داری کی تجدید کرنی پڑتی ہے ۔ بعض مرتبہ دلچسپ واقعات بھی ہوتے ہیں ۔ ایک کمسن لڑکی نے اپنی سہیلی کو بتایا " پرانے ڈیڈی میرے لئے کار لائے تھے اور اب نئے ڈیڈی اڑنے والا جہاز لائے ہیں ۔ "

باہر سے آنے والوں کے لئے لازم ہوتا ہے کہ ہم وطنوں کے لئے کچھ نہ کچھ تبرک لائیں ۔ رشتہ دار سامان کھلنے کا انتظار کرتے ہیں ۔ لگیج کے اطراف گھر والے بیٹھ جاتے ہیں اور باہر سے آنے والا اپنے سامان میں سے ایک ایک چیز نکال کر تقسیم کرنے لگتا ہے ۔ " تمہارے لئے ٹو ان ون ۔ آپ کے لئے شیروانی کا کپڑا ۔ پپو کے لئے کار ۔ چھوٹے کے لئے دوربین ۔ بھائی کے لئے گھڑی ۔ امی کے لئے وٹامن کے انجکشن ۔ " یہ منظر ہمیں اسکول میں دکھائے جانے والے میجک شو کی یاد دلاتا ہے ۔ جادوگر اپنے تھیلے میں سے اشیاء نکال کر بچوں کو دیتا ہے ۔ بچے تالیاں بجاتے ہیں ۔ باہر سے آنے والا جادوگر اپنوں کے لئے کچھ نہ کچھ تحفہ پیش کرتا ہے ۔ باہر سے خالی ہاتھ آنا معیوب بات سمجھی جاتی ہے ۔ کم از کم سگریٹ اور سینٹ ساتھ لانا پڑتا ہے ۔ کہتے ہیں " باہر سے اپنوں کے لئے سگریٹ اور سینٹ بھی نہ لاسکے تو باہر گئے ہی کیوں ؟ یہیں رہتے اچھا تھا ۔ " خلوص سینٹ اور سگریٹ سے آگے بڑھتا ہے تو ملبوسات ، دستی گھڑی ، کیمرہ ، ٹو ان ون سے نوازا جاتا ہے ۔ اکثر بھائیوں کو اپنی بہنوں کے لئے باہر سے جہیز لانا اور دولھا بھائی کو باہر لے جانا پڑتا ہے ۔ بعض نوجوان ایسے بھی ہیں جو باہر سے ہمارے شہر کی کمسن لڑکیوں کے لئے عرب کا بڈھا تحفہ میں لے آتے ہیں ۔ باہر سے آئے ہوئے ایک نوجوان نے ایک عرب کا ہم سے تعارف کروایا " آپ میرے آجر ہیں ۔ حیدرآباد کا نمکین حسن انہیں یہاں کھینچ لایا ہے ۔ کوئی خوبصورت اور نوجوان لڑکی آپ کی نظر میں ہو تو ان کا خیال رکھئیے ۔ یہ ہمارے شہر میں پندرہ دن رہنے والے ہیں ۔ " عرب سے مل کر ہمیں محسوس ہوا کہ وہ نہ صرف ہمارے شہر بلکہ اس دنیا میں

بھی پندرہ دن کے مہمان ہیں ۔ اب آپ سے کیا چھپائیں باہر سے لائے ہوئے بوڑھے نوجوان کو اسی کے ہم عمر حضرات فرزندی میں لینے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں ۔

باہر جاکر آنے والے شہریوں کا لب ولہجہ بدل جاتا ہے ۔ ٹھہر ٹھہر کر دھیمے لہجے میں بات کرتے ہیں دنیا دیکھنے کے بعد ان پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ خاموشی بہتر ہے ۔ اکثر سوالات کے جوابات میں صرف مسکرا کر خاموش ہو جاتے ہیں ۔ دھونس جمانے کے لیے چند عربی اور انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ عربی دانی "کیف حالک ، مبروک اور شکراً" پر مشتمل ہوتی ہے ۔ عربی دانی مبروک اور شکراً سے بڑھ کر "حبیبی ، اھلاً و سھلاً" اور "مرحبا" پر ختم ہوتی ہے ۔ ایک ایسے ہی باہر سے آئے ہوئے صاحب کی مڈبھیڑ ایک ٹھیٹ حیدرآبادی سے ہوئی تو انہوں نے فرمایا "اوئے حیدرآبادی عرب ہمیں شکراً اور مبروک سے آگے بھی عربی آتی ہے ۔ لاحول اور آیت الکرسی پڑھوں گا تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے ۔"

باہر جاکر آنے والے عربی سیکھ لیتے ہیں یا نہیں لیکن ان کی اردو بہتر ضرور ہو جاتی ہے ۔ اردو شعر سمجھنے کا شعور پیدا ہوتا ہے ۔ ادب نواز اور شاعر شناس بن جاتے ہیں ۔ اردو کتابیں اور رسالے خرید کر پڑھتے ہیں ۔ اپنے شہر سے اخبار منگوا کر پڑھتے اور تشویش کا اظہار کرتے ہیں ۔ غزلوں کے کیسٹ خرید کر سر دھنتے ہیں ۔ ایک صاحب نے ہم سے کہا "بے چارے کریں بھی کیا ۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی مجرد زندگی گذارتے ہیں ۔ خلیج کے مخصوص حالات میں اردو شاعری ان کا واحد سہارا ہے ۔" ان کی باتوں سے ہمیں وصل اور فراق کا اندازہ ہوا ۔ اردو بہتر ہونے کے ساتھ بعض اصحاب باہر پہنچ کر شاعر اور ادیب بن جاتے ہیں ۔ دیار غیر میں مشاعرے اور ادبی محفلیں منعقد کرتے ہیں ۔ باہر کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات اور تصویریں وطن میں اہتمام سے شائع کی جاتی ہیں ۔ باہر کے ادیب اور شاعر جب وطن آتے ہیں تو ان کے اعزاز میں تقاریب منعقد ہوتی ہیں ۔

باہر سے آنے والے روپے ، پیسے اور سونا چاندی کے ساتھ ڈھیر سے الکٹرانک آلات سے لدے ہوتے ہیں ۔ گلے میں کیمرہ ، کمر میں واک مین ، ہاتھ میں تھری ان ون اور سامان میں وی سی آر چھپا ہوتا ہے ۔ باہر سے آنے والوں کے گھر ، دن میں باجہ بجتا ہے تو رات میں فلمیں دیکھی جاتی ہیں ۔ کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ اگر آپ کو کسی گھر سے شہنشاہ غزل مہدی حسن کی آواز سنائی دے تو یقین کیجئے اس گھر کا کوئی نہ کوئی فرد باہر ہے ۔

باہر سے آنے والے کے دوست احباب مخصوص قسم کے سوالات کرتے ہیں ۔ باہر کے حالات کیسے ہیں ۔ آپ باہر کیا کر رہے ہیں ۔ کیا پنیے جھاڑوں کو لگے ملتے ہیں ۔ وطن چھوڑنے کے بعد آپ کی قدر اور پذیرائی ہوئی ہوگی ۔ آج تک ہم "اندر" والوں کو تشفی بخش جوابات نہ مل سکے ۔ کہتے ہیں عورت کی عمر اور مرد کی آمدنی نہیں پوچھنی چاہیئے ۔ باہر سے آنے والے مرد کی آمدنی پوچھی جاسکتی ہے ۔ انہیں اپنی آمدنی بتانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا لیکن خدارا پیشہ اور کام کی نوعیت کے بارے میں دریافت نہ کیجئے ۔ شاید ہی صحیح جواب ملے ۔ باہر جانے والے کوئی کام کو عیب نہیں سمجھتے ۔ سنتے ہیں وہاں انجینیر معمار کا کام کرتے ہیں ۔

ڈاکٹر کمپونڈر بن جاتے ہیں ۔ میٹرک کامیاب لوگ باہر آفیسر بنے بیٹھے ہیں ۔ باہر سے آنے والے ایک صاحب نے ہمارے ایک دوست کے تعلق سے کہا " وہ یہاں کام کرنے سے کتراتا تھا ۔ گھر میں نوکروں پر حکم چلایا کرتا تھا ۔ محنت کرنا خلاف شان سمجھتا تھا لیکن وہاں شیخ کے اشاروں پر ناچتا ہے ۔ "

باہر سے گھر لوٹنے والے کے اطراف باہر جانے کے خواہشمند نوجوان بھنبھنانے لگتے ہیں ۔ ان کی دلجوئی اور خدمت کرتے ہیں ۔ بڑے بوڑھے اپنے بچوں کے لئے سفارش کرتے ہیں " بیٹا اسے ویزا دلوادو ۔ تمہارا احسان ہوگا ۔ یہاں یہ کسی قابل نہیں ہے ۔ گھر پر پڑا روٹیاں توڑتا ہے ۔ باہر جائے گا تو چار پیسے کما کر لائے گا ۔ بہنوں کی شادیاں کرے گا ۔ " باہر والے ہر کسی سے فوٹو اور فوٹو کاپیاں " کوشش کروں گا " کی طمانیت کے ساتھ وصول کرلیتے ہیں ۔ فوٹو اور فوٹو کاپیاں موصوف کے جانے کے بعد ردی کی نذر کی جاتی ہیں ۔

باہر مقیم حضرات سال یا دو سال میں ایک مرتبہ چند دن کے لئے اپنے وطن میں قیام کرنے آتے ہیں ۔ یہاں پر انہیں ڈھیر سارے کام انجام دینا ہوتا ہے ۔ ساتھ لائے ہوئے خطوط اور پیامات کو پہنچانا ، ساتھیوں کی خیریت کی اطلاع دینا ، رشتہ داروں سے ملاقات کرنا ، ان کی دعوتوں میں شرکت کرنا اور پیٹ خراب کرلینا ، جائیداد خریدنا ، اپنی شادی کرنا ، پہلی اور اگر موقع ملے تو دوسری تیسری ، بچوں کی سالگرہ یا عقیقہ کرنا یا پھر یوں ہی اپنی طرف سے دوست احباب کی ایک شاندار دعوت کرنا ۔ غیر مقیم شہریوں کی وجہ سے ہمارے شہر کی دعوتوں کا معیار اتنا بلند ہوا ہے کہ ہم جیسے ان دعوتوں میں شریک تو ہوسکتے ہیں لیکن کسی دعوت کا اہتمام نہیں کرسکتے ۔

باہر سے آنے والے شہریوں کو چھوٹے سے وقفے میں پھر واپس جانے کی تیاری بھی کرنی پڑتی ہے ۔ ٹکٹ خریدنا اور سیٹ بک کروانا ، ساتھیوں کے گھروں سے خطوط ، اچار اور کباب کے ڈبے جمع کرنا ، گھر والوں کے مسئلے حل کرنا ، باہر جانے کے خواہشمند نوجوانوں کی ہمت افزائی کرنا اور دوست احباب کی فرمائشوں کی فہرست ساتھ رکھنا بھی اہم کام ہوتا ہے ۔

چٹکیاں بجاتے چھٹیاں ختم ہوجاتی ہیں ۔ واپس جانے کا وقت آپہنچتا ہے ۔ پھر ایک مرتبہ دوست احباب جمع ہوتے ہیں ۔ پھول پہناتے ، گلے ملتے اور امام ضامن باندھتے ہیں ۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی کے مصداق کوئی گھڑی اتار لیتا ہے تو کوئی انگوٹھی چھین لیتا ہے ۔ کپڑے پہلے ہی تقسیم ہوچکے ہوتے ہیں ۔ ایک دو جوڑے کپڑے ، اچار اور کباب سے بھرا ایر بیگ کے ساتھ مگر مچھ کے آنسو بہاتے وداع کیا جاتا ہے ۔ دوسرے دن سے ڈرافٹ ، کیسٹ ، لیٹر اور خود موصوف کے واپس آنے کا انتظار شروع ہوجاتا ہے ۔۔۔ مایا جال کا چکر یوں ہی چلتا رہتا ہے ۔

جولائی ۔ ۱۹۸۵ء

پنجفتہ

قدرت نے انسانی صلاحیتوں کا لحاظ کرتے ہوئے وقت کو دن اور رات میں تقسیم کیا تاکہ انسان دن میں کام اور رات میں آرام کرے ۔ لیکن انسان کی سہل پسند فطرت نے چھٹیاں ایجاد کیں ۔ ہر روز کام کرنے کے بجائے ہفتہ میں چھ دن کام کرنے کی بنیاد ڈالی ۔ ایک دن آرام کے لئے مختص کر لیا ۔ اس تعطیل کے علاوہ وقتاً فوقتاً چھٹیاں بھی منانے لگا ۔ جب انسان کو ہفتہ میں ایک چھٹی سے تسلی نہ ہوئی تو اپنے تساہل کو زندہ رکھنے کے لئے ہفتہ میں دو چھٹیاں لینی شروع کیں ۔ اب ہمارے شہر میں بھی یہی طریقہ رائج کیا گیا ہے ۔ پانچ دن کام کے بعد دو دن کی چھٹی ، جس کے لئے ہم نے "پنجفتہ" کی اصطلاح وضع کی ہے ۔

ہمارا ملک زاہد تعطیلات کے لئے مشہور ہے ۔ شاید ہی دنیا کے کسی اور حصے میں اتنی تعطیلات ملتی ہوں گی ۔ سال کے ۳۶۵ دن میں ۵۲ اتوار کی چھٹیاں ، ۲۴ دن عام تعطیلات ، اتنی ہی اختیاری تعطیلات ، ۱۵ دن رخصت اتفاقی اور ۳۰ دن رخصت خاص کا حق ۔ اب مزید ۵۲ دن ہفتہ کی چھٹیاں ، ان کے علاوہ کسی لیڈر کے مرنے ، کرکٹ یا ہاکی میچ جیتنے کی خوشی میں اور فساد پھوٹ پڑنے پر الگ سے تعطیلات ۔ اس حساب سے ہم سال کے دو تہائی دن چھٹیوں میں گذارتے ہیں اور بقیہ ایک تہائی دن کام کرتے ہیں بلکہ یوں کہئیے کہ کام کے بجائے چھٹیوں کی تھکن اتارتے ہیں ۔ ہمارے اس حساب کتاب سے ایک سیاسی قائد کو موقع ہاتھ آیا ۔ انہوں نے اپنی تقاریر میں اس کو موضوع بنایا" سال میں اتنے کم دن کام کرنے سے ، ہم کیا خاک ترقی کریں گے ۔ ہمیں ترقی کرنا اور آگے بڑھنا ہے تو دن رات محنت کرنی ہوگی ۔ پنجفتہ سے ملک کی ترقی رک جائے گی آج حالات ایسے ہیں کہ عوام کو بغیر کوئی چھٹی لیے ہفتے کے سات دن ، مہینے کے اکتیس دن اور سال کے تین سو پینسٹھ دن صرف کام ہی کام کرنا ہے ۔" اور شاید سیاسی قائدین کا کام مسلسل تقاریر کرتے رہنا ہے ۔ یہ ہمارا اپنا خیال ہے ۔

ہمارا ملک دنیا کی دوسری سب سے زیادہ آبادی والا ملک ہے ۔ فیملی پلاننگ پروگرام زور و شور

سے چلائے جا رہے ہیں۔ ماضی میں "دو یا تین بس" ہوا کرتے تھے۔ پھر "ہم دو ہمارے دو" ہوئے اور اب "دوسرا بھی نہیں بلکہ کبھی نہیں" کا نعرہ لگ رہا ہے۔ آگے کیا ہو، قیاس مضحکہ خیز لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں مشورہ ملے "شادی کیجئے۔ خبردار بچہ نہ ہو۔" فیملی پلاننگ پروگرام کے باوجود ہمارے ملک کی آبادی بڑھتی جارہی ہے۔ فیملی پلاننگ پروگرام سے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہونے اور آبادی میں مسلسل اضافے کی وجہ اب ہماری سمجھ میں آئی ہے۔ ہمیں چھٹیاں زیادہ ملتی ہیں جبکہ دیگر تفریح کے مواقع کم سے کم ہیں۔ ہفتہ میں ایک چھٹی تھی تو آبادی دوسرے نمبر پر تھی۔ اب ہفتہ میں دو چھٹیاں ملیں گی تو وہ دن دور نہیں معلوم ہوتا جب ہمارا ملک نمبر ایک مقام حاصل کرلے گا۔

پنجفتہ کے نفاذ سے اکثر شہریوں کو خوشی بلکہ بے حد خوشی ہوئی ہے۔ پانچ دن کام اور دو دن آرام۔ ہمارے ایک دوست نے کہا "پانچ دن کے بعد دو دن کا آرام بہت اچھا لگتا ہے۔ ہفتہ اور اتوار کو چھٹی منانے کے بعد پیر کو کام پر جانے کے لئے طبیعت نہیں چاہتی، دل چاہتا ہے کہ پیر کو بھی چھٹی ہو۔" بات صرف خواہش تک محدود نہیں ہے۔ بعض لوگ پیر کی صبح بیمار رہنے لگے ہیں۔ کبھی سر درد تو کبھی پیٹ میں مروڑ ہے۔ کسی پیر کو اجابتیں تو کبھی جی متلا رہا ہے۔ پیر کے دن چھٹی منانے پر تمام شکایتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ہمارے ایک ڈاکٹر دوست نے اس مرض کا نام MONDAY FEVER یعنی پیر کا بخار یا پھر پیری بخار بتلایا ہے۔

وہ زمانہ بیت گیا جب صدر خاندان گھریلو ذمہ داریاں نبھانے کے لئے خاطر خواہ وقت دے سکتا تھا۔ آج صدر خاندان اپنے محدود وسائل کے باعث گھر کے معاشی مسائل سے منہ چھپائے پھرتا ہے۔ وہ کم سے کم وقت گھر پر گذارنا چاہتا ہے۔ ہماری مثال لیجئے۔ صبح ۹ بجے تک بچوں سے منہ چھپائے بستر پر دراز رہتے ہیں۔ بچے اسکول جانے کے بعد اٹھ کر دفتر کا رخ کرتے ہیں۔ دفتر ختم ہونے کے بعد ادھر ادھر گھوم پھر کر رات دیر گئے گھر واپس ہوتے ہیں۔ اس وقت تک بچے سو جاتے ہیں۔ بیوی سمجھتی ہے کہ ہم صبح سے محنت کر کے رات گھر آئے ہیں۔ بے چاری دکھڑا رونے کے بجائے ہماری خدمت میں لگ جاتی ہے۔ چھٹی کے دن بھی ہم کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے گھر سے چلے جاتے ہیں تاکہ بچے اپنی ضروریات کی فہرست ہمارے حضور میں پیش نہ کرسکیں۔ "یونیفارم پھٹ گیا ہے نیا سلوائیے۔" "میرا جوتا پرانا ہو چکا ہے۔" "دو ماہ سے اسکول کی فیس باقی ہے۔ نام خارج کرنے کے لئے نوٹس مل چکا ہے۔" بیوی گھر گرہستی کے مسائل لئے الگ جان پر آگھڑی ہوتی ہے "راشن ختم ہو گیا ہے"۔ "کرنٹ کا بل چار ماہ سے باقی ہے" اور موقع پاکر کان میں سرگوشی کرتی ہے "بچی پہاڑ چڑھ رہی ہے"۔ اب جناب ہفتے میں ایک دن اور گھر پر رہنے کے لئے عنایت کیا گیا ہے۔ صدر خاندان کیا کرے۔ کہاں کہاں کی خاک بٹورے۔ ہم نے اپنے ساتھیوں سے اس مسئلے پر بات کی۔ اتفاق رائے سے چھٹیوں میں کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ وقت گذر جائے گا اور معاشی حالت میں سدھار بھی ہوگا۔ چنانچہ ہمارے ایک ساتھی موت سے ڈرا کر بیمہ پالیسی قبول کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ ہمارے ایک اور ساتھی کرانہ دکان پر ہفتہ بھر کے حساب کتاب میں الٹ پھیر کرتے ہیں۔ اب آپ

سے کیا چھپائیں، ہم گلی کوچے گھوم پھر کر پرانا پلاسٹک کا سامان جمع کرتے اور بیچتے ہیں۔

انسان ترقی کرتا ہے تو اسے چھٹیاں منانے کا خیال آتا ہے۔ غیر ترقی یافتہ انسان چھٹیوں سے بے نیاز کام کرتا رہتا ہے۔ ترقی کے ساتھ چھٹیاں منانے کا تصور بیدار ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں پنجفتہ رائج ہے ویک اینڈ شاندار طریقے سے منایا جاتا ہے۔ ہمارے ایک دوست نے جو امریکہ میں رہتے ہیں، ہمیں بتلایا تھا" ویک اینڈ تقاریب میں بہت ENJOYMENT ہوتا ہے۔ گھر چھوڑ کر OUTING کرتے ہیں خوب کھاتے، پیتے اور مدہوش ہو کر DANCE کرتے ہیں۔ ویک اینڈ پر DATING اہم پروگرام رہتا ہے۔" پھر اپنی ایک آنکھ بند کر کے کہا" ہر ویک اینڈ پر ایک نئی DATING " ۔ ان کی باتیں سن کر ہمارا دل امریکہ جانے کے لئے بے چین ہوا تھا۔ ہم نے ویک اینڈ کے خواب بھی دیکھے تھے۔ اب یہی ویک اینڈ ملا ہے تو ہم سوچتے ہیں کہ کیا کریں۔ ہماری اتنی حیثیت کہاں کہ گھر بار چھوڑ کر تفریح کے لئے جائیں اور جائیں تو کیسے جائیں۔ سائیکل پر صرف ایک آدمی سفر کر سکتا ہے۔ بیوی بچوں کا بار کہاں لادیں اگر تفریحاً فلمیں دیکھیں تو ٹکٹ کے پیسے کہاں سے لائیں۔ سنتے ہیں پچھلے زمانے میں راجا مہاراجہ کسی غریب کو امیری کا سبق سکھانا چاہتے تو اسے ایک سفید ہاتھی تحفتاً پیش کرتے تھے۔ ہاتھی کو وہ بیچ اور نہ ہی پال سکتا تھا۔ آج ہمارا حال کچھ ایسا ہی ہے ہفتے میں دو تعطیلات اس سفید ہاتھی کی طرح ہیں۔

پنجفتہ کے نفاذ سے روزمرہ کے معمولات میں فرق آیا ہے۔ پنجفتہ کے نفاذ سے پہلے، صبح دیر سے ہوتی، تفصیل سے اخبار پڑھتے، بازار سے سودا سلف لاتے، ناشتے کے نام پر شکم سیر ہو کر کھاتے، بچوں کو اسکول چھوڑ کر دفتر جاتے، دوپہر لنچ کے بعد کچھ دیر قیلولہ کرتے، دفتر ختم ہونے کے بعد دوستوں سے گپ شپ کرتے، کبھی کبھار شاپنگ کرتے، گھر پہنچ کر گھر والوں کی خیر خیریت دریافت کرتے، کھانا کھاتے اور سو جاتے تھے۔ جب سے پنجفتہ کا نفاذ ہوا لگتا ہے زندگی کی ریل گاڑی جو پاسنجر تھی، اب سوپر فاسٹ بن گئی ہے۔ دفتر جلد شروع اور دیر سے بند ہوتا ہے۔ صبح اٹھ کر رات کا بچا کھچا ناشتہ کیا، اخبار شام کے لئے اٹھا رکھا بچوں سے کہہ دیا کہ اپنا انتظام کر لیں، بغیر ٹفن دفتر کا رخ کیا۔ باوجود کوشش اکثر دیر ہو ہی جاتی ہے۔ لنچ پر کینٹین میں جو بھی ملا زہر مار کیا۔ شام بلکہ رات ہوئی دفتر سے نکلے اور سیدھے گھر پہنچے۔ کھانا کھایا اور اخبار ہاتھ میں لیئے بستر پر دراز ہوئے، چند لمحوں میں ادھر اخبار ہاتھ سے چھوٹا اور ادھر منہ سے خراٹے بلند ہونے لگے۔ گھر والوں کی خیر خیریت بھی دریافت نہ کر سکے۔ ہر ضروری اور غیر ضروری کام ہفتے کے دن انجام دینے کے لئے ملتوی ہوا اور جب ہفتے کا دن آتا ہے تو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ راشن لائیں، بچوں کی تعلیم و تربیت دیکھیں، شاپنگ کریں، کروسین لائیں، تفریح کے لئے جائیں، دوست احباب سے ملاقات کریں یا پانچ مصروف دنوں کی تھکن اتاریں۔ تھکن اتارنے کو فوقیت دی جاتی ہے۔ چادر تان کر سو رہتے ہیں۔ ہر کام خود بخود آئندہ کے لئے ملتوی ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً چند ہفتوں میں کام اور کام انجام نہ دینے کی شکایتوں کا انبار لگ جاتا ہے۔" اسکول یونیفارم اور کتابوں کے لئے چار ہفتوں سے وعدہ ہو رہا ہے"" راشن ختم ہو چکا ہے۔ " ڈاکٹر سے ملاقات کرنی ہے"۔" عرصہ سے کوئی فلم نہیں دیکھی" "پچھلے ایک مہینے میں کسی وقت دو گھڑی

پاس بیٹھ کر ڈھنگ سے بات نہ کی۔" وغیرہ وغیرہ۔

چھٹی کے دن کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بازار بند رہتا ہے۔ دفاتر اور بینک کو چھٹی ہوتی ہے۔ سواریاں نہیں ملتیں۔ سڑکوں پر چہل پہل اور رونق کم ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ دواخانے بھی بند رہتے ہیں چھٹی کے دن کام کا موڈ رہتا ہے اور نہ کوئی کام ہوتا ہے۔ لوگ گھر بیٹھے پلنگ توڑتے رہتے ہیں۔ چند لوگ جو چھٹی کے دن کام کرتے ہیں، حقیقتاً وہ کام نہیں کرتے بلکہ چھٹی منانے والوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ چھٹی کے دن بیمار پڑنے سے بھی تکلف ہوتا ہے، ڈاکٹر جو نہیں ملتے۔ ہمارے چھ سالہ لڑکے کو اس کے دوست کی پیدائش پر اعتراض ہے۔ وہ کہتا ہے "اتوار کو وہ کیوں کر پیدا ہوا، اتوار کو چھٹی ہوتی ہے۔" اب ہفتے میں دو دن چھٹی ملنے سے مشکلات اور تکالیف دو گنی ہو جائیں گی۔

پنجشنبہ کے نفاذ سے لگتا ہے کہ گھریلو خواتین کی دعائیں بر آئی ہیں۔ پانچ دن شوہر اور بچے زائد وقت گھر سے باہر رہیں گے۔ گھر میں سکون رہے گا۔ ہفتہ اور اتوار شوہر گھر کا کام کاج کرے گا اور بیوی آرام۔ ہمارے ایک ساتھی ویک اینڈ پر بچوں کو نہلاتے اور گھر کی صفائی کرتے ہیں۔ ایک اور ساتھی چھٹیوں میں ہفتہ بھر کا پکوان کرتے ہیں۔ انہیں اندیشہ رہتا ہے کہ اگر شوہر گھریلو کام میں مصروف نہ رہے تو بیوی تفریح جانے اور فلم دیکھنے کے لئے اصرار کرے گی، جس کے لئے پیسے چاہئیں جبکہ ماہانہ بجٹ میں تفریح طبع کی گنجائش کسی صورت نہیں نکل سکتی۔ پنجشنبہ سے خواتین کو حاصل مراعات سے ہمیں یہ خیال آیا کہ پنجشنبہ کا نفاذ خواتین کے سال میں ہونا چاہیئے تھا۔

یہ ایک تلخ بات لیکن حقیقت ہے کہ دفاتر میں میسر آرام گھر پر نہیں ملتا۔ دفتر میں آرام دہ پشت بیک کرسی، سر پر پنکھا، وقتاً فوقتاً چائے اور دوستوں کی صحبت جبکہ گھر میں ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر اکڑوں بیٹھے ہیں ایک بچہ کاندھے پر چڑھا ہے۔ دوسرے کا گھٹنا پیٹ میں چبھ رہا ہے۔ ایک پنکھے کی ہوا سارا خاندان کھا رہا ہے۔ تیوریاں چڑھائے ہر دم منہ کھولے بیوی کھڑی ہے۔ بچوں کی خواہشات کی تکرار، قرض خواہوں کا اصرار اور اڑوس پڑوس سے چیخ و پکار، ان تمام مصیبتوں کا واحد حل دفتر ہے۔ گھر پر رہنے کی سزا ہفتے میں ایک دن بھگت لیا کرتے تھے۔ لیکن اب پنجشنبہ کے نفاذ سے دو دن گھر پر کیسے گذاریں۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا" گھر پر خیال آتا ہے کہ پنجشنبہ کے خلاف جہاد شروع کر دوں یا پھر جنگل کی راہ لوں۔"

پنجشنبہ کا نفاذ ہمارے شہر کے لئے نیا نہیں ہے۔ چند برس قبل بھی نافذ کیا گیا تھا۔ تجربہ ناکام رہا۔ ہمیں کام کرنے کا طریقہ تو خیر آتا نہ تھا چھٹیاں منانے کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔ سبھی مسائل سے دوچار ہوئے اور چار و ناچار چھ دن کا ہفتہ رائج ہوا۔ اب پھر وہی پرانی شراب نئی بوتل میں حاضر ہے۔ ہماری دعا ہے کہ کم از کم اب ہمیں کام کرنے کا طریقہ اور چھٹیاں منانے کا سلیقہ آئے۔ آمین۔ ثمہ آمین۔

اگست۔ ۱۹۸۵ء

پھر وہی ہفتہ

پچھلے سال اگست کے مہینے میں "شگوفہ" کے صفحات پر ہمارا مضمون "پنج ہفتہ" شائع ہوا تھا۔ اس وقت ہمارے شہر میں پانچ دن کا ہفتہ رائج کیا گیا تھا۔ ایک سال بعد ہم پھر اگست کے مہینے میں "پھر وہی ہفتہ" کے زیر عنوان آپ سے مخاطب ہیں۔

چند دن قبل اعلان ہوا کہ ہماری ریاست میں پھر سے ہفتے میں چھ دن کام ہوگا۔ لہذا ہفتے کے دن کی چھٹی منسوخ ہوگئی۔ دفاتر اپنے سابقہ وقت پر صبح دیر سے شروع اور شام جلد بند ہونے لگے۔ اہل حیدرآباد جو مزاج یار بلکہ آر یعنی این ٹی آر (ریاست آندھرا پردیش کے سابقہ چیف منسٹر جناب این ٹی راما راؤ) میں آئے کہہ کر ملے جلے انداز میں اظہار خیال کرنے لگے۔ پنج ہفتہ کا نفاذ ملازمین کو سہولت پہنچانے کی غرض سے کیا گیا تھا اور اب چھ دن کے ہفتے کا مقصد عوام کو سہولت پہنچانا ہے۔ ملازمین اور عوام کو سہولت پہنچانے کے علاوہ ہفتے سے پنج ہفتہ اور پنج ہفتہ سے ہفتے میں تبدیلی کی کوئی اور وجہ نہیں بتلائی گئی۔

ہم نے بہت غور کیا اور سوچا کہ پنج ہفتہ سے کیسے فائدہ تھا۔ ہفتہ کے دن زندگی کی ہماہمی دوسرے پانچ دنوں کی طرح رہتی ہے۔ کارخانوں میں مزدور کام کرتے ہیں۔ بازار کھلے ہوتے ہیں۔ لوگ بیمار پڑتے اور دواخانے جاتے ہیں۔ سڑکوں پر روز جیسی چہل پہل رہتی ہے۔ حادثات بھی ہوتے ہیں۔ بچے اسکول اور کالج جاتے ہیں۔ صرف دفاتر کو چھٹی تھی۔ ہفتہ کے دن ہمیں دفتر نہ جاتا دیکھ کر ہمارا لڑکا اسکول کے بجائے دفتر جانے کی ضد کرنے لگا تھا۔ وجہ دریافت کرنے پر اس نے کہا "دفتر کو ہفتہ اور اتوار دو دن چھٹی ہوتی ہے۔"

پنج ہفتہ سے صرف بابو لوگوں کو فائدہ تھا۔ بابو لوگوں کو ہفتے میں دو دن چھٹی حاصل تھی لیکن ان چھٹیوں کے صحیح ڈھنگ کے استعمال سے وہ قاصر تھے۔ بابو لوگوں کی بندھی ٹکی زندگی ہوتی ہے جو صدیوں سے مقرر کردہ معمولات کے اطراف گھوم رہی ہے۔ میز کرسی، فائیلوں کا انبار اور ان فائیلوں پر روایتی

گھسے پٹے نوٹس، محدود آمدنی، کثیر العیالی، تنخواہ ملنے پر قرضداروں میں تقسیم کر دینا اور بقیہ دن پھر قرضہ کر کے زندگی بسر کرنا۔ حالات اجازت نہیں دیتے کہ وہ ہفتہ اور اتوار کو تفریح کے مزے لوٹیں، شاپنگ کریں، فلمیں دیکھیں یا ہوملنگ کریں۔ چھٹی کے دن بھی بابو صاحب کا ایک معمول ہوتا ہے۔ دیر تک سونا، نیند سے بیدار ہو کر بیوی سے جھگڑنا اور بچوں پر غصہ اتار کر شہر کی سڑکیں ناپنے نکل جانا۔ شام تھک کر واپس آنا اور منہ پھلائے بھوکا سو جانا۔ اس سلیقہ سے چھٹی گذارنے کے لئے ہفتہ میں ایک دن کافی ہے۔ دو دن چھٹی کا نوٹ کس بابو نے پیش کیا تھا۔ ۴۸ گھنٹے چھٹی کا پلان کس بابو نے کن حالات کے تحت اور کیوں ڈرافٹ کیا تھا۔ ہمارے لئے یہ ایک معمہ ہے۔

ہماری ناقص رائے میں پنجشنبہ کی ناکامی کی وجہ ملاوٹ ہے۔ پنجشنبہ کے دوران ہمیں پانچ دن خالص کام کرنا اور دو دن آرام کرنا نہیں آیا۔ ہم ملاوٹ کے عادی ہو چکے ہیں۔ کوئی بھی خالص شئے ہمیں راس نہیں آتی۔ چاول میں کنکر، دودھ میں پانی، تنخواہ میں رشوت، کاٹن میں ٹیرین، عبادت میں ریاکاری، غرض ہماری زندگی کے ہر پہلو میں ملاوٹ ہے۔ دفاتر میں بھی ہمارا طریقہ کار، کام اور تفریح کو ملا کر وقت پورا کرنا ہے۔ صبح دن چڑھنے تک آرام کرنے کے بعد دیر سے دفتر پہنچتے ہیں۔ حاضری کے رجسٹر پر دستخط کی۔ گھر سے دفتر کے سفر کی تھکان اتارنے کے لئے کچھ دیر سستائے۔ دوست احباب کی خیریت دریافت کی، سیاست پر تبادلہ خیال کیا، الماری سے فائلیں، کاغذات اور رجسٹر نکالے، گرد صاف کی، انہیں میز پر پھیلایا، پن کھولا اور ساتھیوں کے ساتھ چائے پینے اٹھ گئے۔ بحالت مجبوری کبھی کبھار چائے سیٹ پر ہی پی ورنہ ہر روز چائے کینٹین میں پی جاتی ہے۔ چائے پی، یار دوستوں سے گپ شپ کی۔ ضرورت سے فارغ ہو کر سیٹ پر واپس پہنچتے ہیں۔ کچھ دیر انہماک سے کام کیا کہ لنچ کا وقت ہوا۔ ہر چیز جیسی بھی اور جہاں بھی ہو، اسی حالت میں اسے چھوڑا، ٹفن باکس اٹھایا اور لنچ کرنے چلے گئے۔ لنچ کیا چائے پی اور سگریٹ پھونکا، کچھ دیر قیلولہ کیا، لنچ کا وقت ختم ہونے کے بہت دیر بعد سیٹ پر پہنچتے ہیں۔ چند منٹ کام کیا کہ شام کی چائے کا وقت ہوا۔ چائے پی۔ سستی توڑی اور چستی سے دفتر چھوڑنے کی تیاری میں لگ گئے۔ مختلف کاغذوں اور فائیلوں کو اکٹھا کیا، انہیں الماری میں ٹھونسا، اکثر اوقات وقت سے پہلے تو کبھی کبھار وقت پر دفتر چھوڑا۔ دوستوں کے ساتھ چہل قدمی کی۔ کبھی فلم دیکھی تو کبھی شاپنگ کی۔ رات دیر گئے گھر پہنچتے ہیں۔ چھٹی کے دن دو ایک فائیل گھر لے آتے ہیں۔ گھر پر کام کو یاد کرتے ہوئے آرام کرتے ہیں۔ شاید ہی کوئی کام کے وقت کام اور چھٹی کے دن صرف آرام اور تفریح کے مزے لوٹتا ہے۔ کام اور تفریح ایک ساتھ کرنے کی عادت کے سبب ہمیں اتوار کی چھٹی بھی نہیں ملنی چاہیئے۔ ہفتہ واری چھٹیاں انہیں ملنی چاہئیں جنہیں کام کرنے کا طریقہ اور آرام کرنے کا سلیقہ آتا ہو۔

پچھلے چند برسوں سے ہمارے شہر میں نت نئے تجربے کئے جا رہے ہیں۔ ہر تجربہ ناکام ہو رہا ہے۔ وقفے وقفے سے وزیر اعلیٰ تبدیل کرنے کا عمل غلط رہا۔ جمہوری حکومت کو برطرف کرنے کا تجربہ ناکام رہا۔ وظیفے پر سبکدوشی کی عمر کم کرنا مصیبت ثابت ہوئی۔ پنجشنبہ کا نفاذ ہمارے شہر میں دوسری مرتبہ نافذ ہوا۔

دونوں بار یہ تجربہ ناکام رہا۔ وجہ کے تعلق سے ہم نے اپنی ناقص رائے کا اظہار کر دیا، لیکن حقیقتاً دوسری مرتبہ ناکامی کی سنجیدگی سے اعلیٰ سطحی تحقیقات ہونی چاہیئے۔ کیوں، دو مرتبہ بھی ہمارے شہر میں دو دن کی چھٹیاں رائج نہ ہو سکیں۔ برآمد شدہ نتائج کی روشنی میں تیسری مرتبہ سوچ سمجھ کر پنجفتہ کو نافذ کرنا چاہیئے۔ مختلف انقلابی اقدامات کرنے ہوں گے۔ ملازمین کو چھٹی الاونس دینے کے تعلق سے سوچنا چاہیئے۔ کم سے کم چائے پینے والے ملازم کو انعام و اکرام سے نوازا جائے۔ سیٹ پر ملازم کو زیادہ وقت بٹھانے کے لئے سیٹ بیلٹ لگانے ہوں گے۔ بیلٹ میں قفل بھی ڈلنے ہوں گے۔

ملازمت کرنے والے شوہر اور بیوی کے لئے پنجفتہ ایک نعمت سے کم نہ تھا۔ کہتے ہیں زندگی کی گاڑی کے دو پہیئے شوہر اور بیوی ہیں۔ ماضی میں زندگی کی گاڑی بائسیکل کی طرح ایک پہیئے سے چلتی تھی۔ دوسرا پہیہ خود بخود آگے بڑھتا چلا جاتا تھا لیکن مہنگائی کے اس دور میں زندگی کی گاڑی کو چلانے کے لئے دونوں پہیوں کا کام کرنا ضروری ہے۔ صبح علیک سلیک اور ناشتے کے بعد شوہر اور بیوی اپنے اپنے دفتر چلے گئے۔ شام تھکے تھکائے گھر پہنچے۔ جس سے جو بن پڑا کام کیا اور اپنے چہرے مخالف سمت کئے سو گئے۔ اس کے برخلاف چھٹی کے دن شوہر اور بیوی مل بیٹھتے، اکھٹے ناشتہ کرتے، فلم جاتے اور لطف اٹھاتے تھے۔ ہفتہ کے دن بچے بھی گھر نہ ہوتے تھے۔ شوہر اور بیوی کو گھر پر اکیلے کچھ زیادہ ہی مزا آتا تھا۔ ہمارے ایک دوست کہتے ہیں کہ صرف چھٹی کے دن وہ اور ان کی بیگم، شوہر اور بیوی ہوتے ہیں بقیہ دن دونوں " ورکنگ پارٹنرز " بنے رہتے ہیں۔ گویا پنجفتہ میں ورکنگ شوہر اور بیوی کے تعلقات استوار تھے۔

پنجفتہ کے نفاذ کے بعد سے چند لوگوں نے اپنی عادتوں میں تبدیلی لائی تھی۔ صبح جلد اٹھتے، پھرتی سے کام کاج کر کے دفتر پہنچتے تھے۔ شام میں دفتر دیر سے بند ہوتا تھا۔ دن تمام کی تھکن کے بعد میٹھی نیند آتی تھی۔ ہفتہ اور اتوار کو آرام کرتے، دوست احباب سے ملتے اور چھٹی کا لطف اٹھانے لگے تھے۔ اب پھر سے انہیں اپنی وہی پرانی عادتیں اپنانی ہوں گی۔ سورج چڑھے تک سوتے رہنا اور آرام سے دفتر پہنچنا۔ رات دیر گئے تک دوست احباب کے ساتھ گپ شپ کرتے رہنا۔

اکثر لوگوں نے پنجفتہ کے نفاذ کے باوجود اپنی پرانی عادتوں میں تبدیلی نہیں لائی تھی۔ حسب روایت قدیم اپنی عادتوں سے مجبور تھے۔ دفتر دیر سے آتے اور جلد چلے جاتے تھے۔ ہمارے ایک ایسے ہی دوست نے چھ دن کام کے ہفتے کے پھر سے نفاذ پر کہا "میاں ہمیں یقین تھا کہ پانچ دن کا ہفتہ چلنے والا نہیں ہے۔ اسی لئے ہم نے نئے اوقات کی پابندی نہیں کی۔ پرانی اوقات پر ہی رہے۔" ہم نے جواب دیا " اگر آپ وقت پر آتے اور جاتے تو شاید پھر سے چھ دن کام کا ہفتہ نافذ کرنے کی نوبت نہ آتی۔" ہمارے دوست نے فضاء میں دیکھتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں کہا " صرف اوقات کی تبدیلی سے حالات میں بہتری پیدا نہیں ہوتی "

ہماری سڑکیں

مضمون کا عنوان "ہماری سڑکیں" غلط ہے ۔ جناب والا ، ہمارے اور محمد قلی قطب شاہ کے شہر میں سڑکیں ہیں کہاں ۔ شہر میں صرف راستے ہیں اور ہر راستہ کسی چھوٹے یا بڑے حادثے کی طرف لے جاتا ہے ۔ جب کوئی اجنبی کسی حیدرآبادی سے دریافت کرتا ہے "یہ سڑک کہاں جاتی ہے" اسے جواب ملتا ہے "یہ سڑک کہیں نہیں جاتی ۔ یہیں پڑی رہتی ہے لیکن اس پر سفر کرنے والے عالم بالا کو پہنچ جاتے ہیں ۔" ہمارے مضمون کا عنوان "حیدرآباد کے (خطرناک) راستے" ہونا چاہئیے تھا ۔ ہماری سادگی کا اندازہ لگائیے کہ ہم ان خطرناک راستوں کو سڑکیں کہتے ہوئے کئی برس سے دھوکہ کھاتے اور حادثوں سے گذرتے چلے آرہے ہیں ۔

مسافرین کی سہولت کے لئے سڑکیں بنوائی جاتی ہیں ۔ یہ سڑکیں کئی قسم کی ہوتی ہیں ۔ مٹی کی سڑک سنگ سیلو کی سڑک ، ڈامر کی سڑک ، سمنٹ کی سڑک وغیرہ ۔ ہمارے شہر میں مختلف راستوں پر مختلف قسم کی سڑکیں بنوائی گئی ہیں لیکن ان سڑکوں کی انفرادیت یہ ہے کہ راہ گیروں سے زیادہ سڑکیں بنوانے اور مرمت کرنے والوں کو فائدہ پہنچتا ہے ۔ سنگ سیلو کی سڑکیں آس پاس کے مکانوں میں فرش کا مسئلہ حل کرتی ہیں ۔ راہ گیروں کو سڑکیں استعمال کرنے کی پاداش میں نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے ۔ سنگ سیلو کی سڑکوں پر ٹھوکریں کھائے بغیر چل نہیں سکتے ۔ یوں بھی شہر کی سڑکوں پر پیدل چلنا ایک آرٹ ہے ۔ کبھی ٹھوکر کھاکر سنبھلنا پڑتا ہے تو کبھی گر کر اٹھنا پڑتا ہے ۔ کبھی چھلانگ لگانی پڑتی ہے تو کبھی اچھلنا اور کودنا پڑتا ہے ۔ کبھی ایک ٹانگ سے لنگڑانا پڑتا ہے تو کبھی پیروں اور ہاتھوں کی مدد سے جانوروں کی طرح پھدکنا پڑتا ہے ۔ کہتے ہیں پیدل چلنے سے بہتر کوئی ورزش نہیں ہے ، اگر آپ اس مقولے کی حقیقت جانچنا چاہیں تو حیدرآباد کی سڑکوں پر پیدل چلا کیجئیے ۔ ورزش کے علاوہ بعض مرتبہ آپ کی مرمت بھی ہوجائے گی ۔ گھٹنے اور کہنیاں چھل جاتی ہیں ۔ پنڈلیوں پر ورم آجاتا ہے ۔ اعضاء شکنی ناقابل برداشت ہوتی ہے ۔ سواری استعمال کرنے

والوں کے لئے ٹائر ٹیوب ایک مستقل مسئلہ بنے رہتے ہیں ۔ مضبوط سے مضبوط ٹائر ٹیوب بار بار پنکچر ہو کر بہت جلد داغ مفارقت دے جاتے ہیں ۔ سیکل اور اسکوٹر پنکچر ہو کر سوار پر سواری کرنے لگتے ہیں ۔ ہم بطور حفظ ماتقدم ہمیشہ چار عدد ٹائر ٹیوب ساتھ رکھتے ہیں ۔ پتہ نہیں کب اور کہاں گاڑی پنکچر ہو جائے ۔ ٹائر اور ٹیوب ساتھ رکھنے پر پڑوسیوں کو ہم پر ادیب کے بجائے پرانے ٹائر اور ٹیوب کے بیوپاری کا گمان ہونے لگا ہے ۔ ٹائر اور ٹیوب کے بعد لارگ، شاک ابضار بر، سسپین سراور دوسرے پرزے خراب ہونے لگتے ہیں ۔ میکانک حضرات گاڑیوں کی ہر خرابی کی ذمہ داری شہر کی سڑکوں پر ڈالتے ہیں ۔ ہم وکالت کرتے ہیں کہ گاڑیوں کے فاضل پرزے تیار کرنے والی کمپنیاں ہماری سڑکوں کی نگہداشت کرنے والوں کو کمیشن دیں ۔ کیا پتہ دے بھی رہی ہوں!

ہمارے شہر کی سڑکیں حساس اور نازک طبیعت کی مالک ہیں ۔ گرمی ان سے برداشت ہو نہیں پاتی انہیں پسینہ آتا ہے ۔ پگھل جاتی ہیں اور سواری سے چمٹ جانے کی کوشش کرتی ہیں ۔ بارش کا موسم سڑکوں کے لئے خطرناک ہوتا ہے ۔ ذرا سی بارش سڑکوں کو بہالے جاتی ہے ۔ بعض سڑکیں بارش کے موسم میں سڑکیں نہیں رہتیں ۔ اپنا وجود گنوا کر تالاب بلکہ ندیاں بن جاتی ہیں ۔ سرما کے موسم میں سڑکیں سردی میں پڑی پڑی ٹھٹھر جاتی ہیں ۔ سڑکیں حساس ہونے کے علاوہ نحیف، کمزور اور ناتواں بھی ہیں ۔ آخر بیچاری سڑکیں کہاں تک اپنے سینے پر بوجھ برداشت کریں گی ۔ زائد بوجھ سے سڑکیں جگہ جگہ سے ٹوٹ جاتی ہیں ۔ ہر دن سڑکوں کے دامن سے کئی گڑھے تولد ہوتے ہیں جن کا درد زہ مسافرین کو برداشت کرنا پڑتا ہے ۔ اگر ہماری بات کا یقین نہ آئے تو آٹو رکشہ میں چند فرلانگ سفر کر لیجئے ۔

ہماری سڑکیں عجیب و غریب اور بے ہنگم ہیں ۔ عقل حیران رہ جاتی ہے ۔ ایک کشادہ سڑک چلتے چلتے پتلی گلی بن جاتی ہے اور کبھی تنگ اور تاریک گلی میں سے ایک میدان نکل آتا ہے ۔ پرانے شہر کی گلیاں تو وبال جان ہوتی ہیں ۔ اجنبی کو چھوڑیئے خود حیدرآبادی ان گلیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے ۔ تبھی تو صبح کا بھولا شام گھر آئے تو اسے حیدرآباد کی گلیوں کا مارا کہتے ہیں ۔ بعض راستے پر اسرار طریقے سے ختم ہوتے ہیں کسی راستے کا اختتام کسی گھر کے صحن میں ہوتا ہے ۔ کوئی راستہ کسی کے بیت الخلاء میں پہنچا دیتا ہے ۔

سڑکیں اپنے شکم میں بہت ساری فاضل اور فضول اشیاء لئے ہوتی ہیں ۔ کرنٹ اور ٹیلیفون کے تار نل کے پائپ اور ڈرینج کی ناقص موریاں سڑک کے نیچے موجود رہتی ہیں ۔ مختلف محکمہ جات میں ہم آہنگی نہیں ہے ۔ وقت بے وقت اور ضرورت بلا ضرورت سڑک کے شکم کو بے دردی سے چیر پھاڑ کر کرنٹ، ٹیلیفون، نل اور ڈرینج کے نظام کا معائنہ کیا جاتا ہے ۔ چیر پھاڑ سے جو زخم بنتے ہیں وہ کبھی مندمل نہیں ہوتے، ناسور بن جاتے ہیں ۔ رستے رہتے ہیں ۔ پانی اور غلاظت جوالا مکھی بن کر ابل پڑتے ہیں ۔ سڑک ڈوب جاتی ہے ۔ گندگی کا راج ہوتا ہے ۔ چو طرف بدبو پھیل جاتی ہے ۔ ایسے وقت ہمیں ان ممالک کی یاد آتی ہے جہاں کی سڑکیں عطر ریز ہوتی ہیں ۔

بارش کے دوران سڑکوں پر پانی کی نکاسی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔ بوندا باندی سے ہی سڑک

پانی میں ڈوب جاتی ہے۔ معمولی بارش سے گھٹنوں بلکہ بعض جگہ کر تک پانی جمع ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کا سفر رک جاتا ہے صرف پانی کا سفر جاری رہتا ہے۔ سہ راہے اور چوراہے ندیوں کے سنگم کا منظر پیش کرتے ہیں۔ ان مشکلات کے پیش نظر ہمارے ایک دوست بارش میں بڑبڑاتے ہیں "یا میرے مولا شہر میں نہ بارش کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کی قدر ہوتی ہے۔ تو اپنی اس رحمت کو شہر میں برسا کر ضائع نہ کر۔ بارش کی ضرورت کھیتوں اور باؤلیوں پر ہوتی ہے۔ تو بارش کو وہیں لے جا۔"

سڑک پر سواریوں کی رفتار کو قابو میں رکھنے کے لئے جگہ جگہ اسپیڈ بریکر بنائے گئے ہیں۔ ہماری نظر میں اسپیڈ بریکر بنانا غیر دانشمندانہ قدم ہے، اس لئے کہ سڑکوں پر ہر لمحہ کئی اسپیڈ بریکر بلکہ سواری بریکر بنتے رہتے ہیں۔ بنائے گئے اسپیڈ بریکر کے لئے اشارہ موجود رہتا ہے جس پر عمل کرنے سے نقصان کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ بغیر اشارہ ابھرنے والے اسپیڈ بریکر یکدم سے نمودار ہوتے ہیں۔ راہ گیر بوکھلاہٹ میں ایکسیڈنٹ کر بیٹھتا ہے۔ تب اسپیڈ بریکر، سواری بریکر اور راہ گیر بریکر بلکہ بعض مرتبہ لائف بریکر بن جاتے ہیں۔

ہمارے شہر کی سڑکیں کھمبوں کی سڑکیں ہیں۔ سڑک پر کئی کھمبے کھڑے رہتے ہیں۔ برقی اور ٹیلیفون کے کھمبے، خیر مقدمی کمانوں کے کھمبے، سڑک اور گلی کے نام کی تختیوں کے کھمبے، اشتہارات کے کھمبے ٹی وی اور ریڈیو کے کھمبے، پتنگ لوٹنے کے کھمبے اور بلا مقصدی کھمبے۔ غرض سڑک پر کھمبے ہی کھمبے بکھرے نظر آتے ہیں۔

ہماری سڑکوں کی طبی افادیت سے اطبا کو انکار نہیں ہے۔ سڑکیں زود ہضم اور قبض کشا ہوتی ہے۔ جب ہم بد ہضمی اور قبض کی شکایت لئے ڈاکٹر سے رجوع ہوتے ہیں تو ہمیں شہر کی سڑکوں پر چند فرلانگ چہل قدمی کا پر خلوص مشورہ دیا جاتا ہے۔

سڑکوں کی نگہداشت ایک نامور محکمہ کرتا ہے جسے عرف عام میں "کھایا پیا اور چل دیا" کہتے ہیں۔ اس محکمے کی کارکردگی کے تعلق سے ہم ایک واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس کی تشہیر لطیفہ کے طور پر ہو چکی ہے۔ شہر کے ایک گڈھے کے پاس ایک شرابی کھڑا ہو کر گنتی کر رہا تھا "پچیس --- پچیس --- " ایک صاحب کو تشویش ہوئی۔ انہوں نے قریب جاکر استفسار کیا۔ شرابی نے گڈھے میں دھکا دے کر کہا "چھبیس --- چھبیس ---"

ہم حیدرآبادی شہر کی سڑکوں سے حیران اور پریشان رہتے ہیں۔ جان ہتھیلی پر لئے سر سے کفن باندھے گھر سے باہر نکلتے ہیں۔

کونسا ہے وہ شہر بھلا بچو! بوجھو تو جانیں
جتنے جس کی گلیوں میں، سڑکیں ہیں نالیوں جیسی!

اگست۔ ۱۹۸۳ء

فٹ پاتھ

آبادی میں اضافے کے ساتھ راستوں کی تقسیم ہورہی ہے۔ ایک طرف سے آنے اور دوسری جانب سے جانے والوں کے لئے سڑک کے دو حصے ہوئے اور پھر آدمی سڑک مختلف حصوں میں بٹ گئی۔ سڑکوں کی تقسیم سے کئی فٹ پاتھ وجود میں آئے ہیں۔ اصل سے بڑھ کر سود کے مصداق راستوں پر فٹ پاتھ زاہد اور سڑکیں کم ہو گئیں۔ کچھ حد تک بے روزگاری کا مسئلہ حل ہوا۔ چند لوگوں کو رہائش کے لئے جگہ ملی۔ دیسی طب کو فروغ ہوا۔ سستی دکانیں اور ہوٹلیں کھل گئیں۔ تفریح طبع کا سامان مہیا ہوا۔ کئی سہولتیں ہم حیدرآبادیوں کو فٹ پاتھ کی وجہ سے حاصل ہیں۔

مضمون لکھنے کے دوران بیگم نے دریافت کیا "کیا لکھ رہے ہو۔" ہم نے جواب دیتے ہوئے سوال کیا "فٹ پاتھ پر مضمون لکھ رہا ہوں۔ کیا تم فٹ پاتھ کی تعریف کر سکتی ہو"۔ جواب ملا "فٹ پاتھ وہ بازار ہیں جہاں اشیاء بغیر شوروم کے خرچے اور ٹیکس کے بغیر سستے دام مل جاتی ہیں۔" ہم نے کہا "لیکن فٹ پاتھ تو پیدل چلنے کے لئے ہوتے ہیں۔" بیگم فلسفیانہ انداز میں گویا ہوئیں "فٹ پاتھ پیدل چلنے کے لئے وہاں ہوتے ہیں جہاں کوئی پیدل نہیں چلتا، ہر کوئی کار میں فراٹے بھرتا گذر جاتا ہے۔ جہاں لوگ پیدل چلتے ہیں وہاں فٹ پاتھ، بازاروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔" ہم سوچنے لگے۔ واقعی ہمارے شہر کا ہر فٹ پاتھ ایک بازار ہے۔ ہر شئے فٹ پاتھ پر مل جاتی ہے بلکہ بعض چیزیں صرف فٹ پاتھ پر ہی دستیاب ہیں۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ فٹ پاتھ پر شاپنگ کرنا ایک آرٹ ہے جبکہ سجی سجائی دکانوں میں خریدی کرنا بے وقوفی ہے۔ فٹ پاتھ کے بازار کا ارتقائی عمل دلچسپ ہوتا ہے۔ تاجر اپنی اشیاء بستہ اور ہاتھ میں لئے چلتے پھرتے بیوپار کرتے ہیں۔ تھک کر کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ بستے کی اشیاء چار پائی پر جمع ہو جاتی ہیں اور بستہ ایک سائبان بن جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ چلتی پھرتی دکان پکی دکان بن جاتی ہے۔ چند سال بعد دکان کو پھر سے فٹ پاتھ بنانے کی خاطر ڈھا دیا جاتا ہے۔ فٹ پاتھ کے بازار سجتے، سنورتے اور اجڑتے

بستے ہیں۔

سماج کا ایک طبقہ جنہیں "فٹ پاتھیئے" کہا جاتا ہے، فٹ پاتھ پر رہائش پذیر ہوتا ہے۔ ہمارے شہر میں فٹ پاتھ سے رہائش کا مسئلہ بھی حل ہوا ہے۔ فٹ پاتھ کا گھر مختصر مفید ہوتا ہے۔ مین کا چھت اور عمارت کی دیواریں۔ ڈرائنگ روم اور نہ ہی بیڈ روم کا جھنجھٹ۔ ہر کام کے لئے ایک کمرہ۔ دل چاہا تو گھر کو سر پر اٹھایا اور نقل مقام کیا۔ انسانوں کے ساتھ مویشی بھی فٹ پاتھ پر بسیرا کرتے ہیں۔ مویشی جو آزادانہ سڑکوں پر جھٹکا کرتے ہیں ان کے لئے اب چبوتروں کی شکل میں اسٹیج بن گئے ہیں۔

فٹ پاتھ سیر و تفریح کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ چند مخصوص تماشوں کو جنہیں اسٹیج نہیں کیا جاسکتا فٹ پاتھ پر بتلایا جاتا ہے۔ "سانپوں کا کھیل" "بندریا کا تماشہ" "ریچھ کا ناچ" "جادوگر کی ساحری" اور دیگر تماشے فٹ پاتھ پر ہر دن دکھائے جاتے ہیں۔ ان تماشوں کو فٹ پاتھ پر ہی دیکھنے میں مزا آتا ہے۔ کھیل تماشوں کے علاوہ فٹ پاتھ پر دیگر فنون لطیفہ کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے۔ کوئی آرٹسٹ اپنے فن کا مظاہرہ فٹ پاتھ پر کرتا اور داد کے ساتھ اجرت بھی پاتا ہے۔ فٹ پاتھ پر کہیں کوئی شاعر لہک لہک کر غزل سرا ہیں۔ فٹ پاتھ سے آرٹ اور کلچر کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

ہمارے ایک دوست نے ایک مرتبہ ہم سے کہا" ترقی یافتہ ممالک میں جنسی تعلیم عام کرنے کی کوشش زور و شور سے ہورہی ہے جبکہ ایک زمانہ پہلے سے اپنے یہاں جنسی تعلیم سڑکوں اور فٹ پاتھ پر صلائے عام ہے۔ "ہم بکواس کرنے پر ان سے الجھ پڑے" یہ نہیں ہو سکتا۔ "وہ ہمیں کھینچ کر ایک فٹ پاتھ پر لے گئے جہاں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ بھیڑ کو چیر کر ہم اندر گئے تو دیکھا فٹ پاتھ پر دواخانہ سجا ہے۔ مختلف جڑی بوٹیاں بکھری پڑی ہیں۔ مرتبانوں میں حلوے اور مربے رکھے ہیں۔ حکیم صاحب تصاویر کی مدد سے جنسی تعلیم کے ساتھ دواؤں کا سیل کر رہے تھے۔ اس کے بعد، ہم نے مزید کئی فٹ پاتھوں پر مختلف دواخانے لگے دیکھے۔ جڑی بوٹی، جانوروں کی کھالیں، ہمہ اقسام کے تیل اور مونچھوں پر تاؤ دیتے معالجین، ایسے لگا سارے شہر کی جوانی خطرے میں ہے۔

ہمارے شہر میں فٹ پاتھ مکان کے صحن کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ فٹ پاتھ پر گائے، بھینس، بکریوں اور مرغیوں کو پالتے ہیں۔ کپڑے سکھاتے ہیں۔ بچے کرکٹ کھیلتے ہیں۔ بڑے خوش گپیاں کرتے ہیں۔ پھر ہوتا یوں ہیکہ فٹ پاتھ کی حصار بندی کی جاتی ہے اور پھر فٹ پاتھ باضابطہ گھر کا صحن بن جاتا ہے۔ ہم اپنے ایک دوست سے واقف ہیں۔ صاحب موصوف کے شاندار مکان میں صرف دو کمرے ان کے اپنے ذاتی ہیں۔ بقیہ حصہ کسی زمانے میں فٹ پاتھ ہوا کرتا تھا۔

فٹ پاتھ پر ہوٹلیں بھی ہوتی ہیں۔ ہر پکوان سستے دام فٹ پاتھ پر مل جاتا ہے۔ بعض کھانے کی اشیاء کو فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر دھول اور گرد کے ساتھ جب تک نہ کھائیں، طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ کباب روٹی، مسالہ مرچی، پانی پوری، پاؤ بھاجی وغیرہ۔ ان کھانوں کے خیال سے ہی منہہ میں پانی بھر آتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ ناشتے کے لیے وقت گنوانا زیادتی ہے۔ چلتے پھرتے ناشتہ کرنا چاہیئے۔

ناشتے کے لئے فٹ پاتھ سے بہتر کوئی اور مقام نہیں ہو سکتا۔

چھٹی کے دن فٹ پاتھ پر اسپیشل پروگرام رہتا ہے۔ فٹ پاتھ پر نت نئی دکانیں لگتی ہیں۔ کھیل تماشے بتلائے جاتے ہیں۔ فٹ پاتھ کی سیر ہماری عام اور سستی تفریح ہے۔ دکانوں سے بچ کر چلنے اور راہ گیروں سے ٹکرا کر سنبھلنے میں جو ورزش ہوتی ہے وہ ہمیں کھیل کود کا مزا دیتی ہے۔ کم خرچ بالا نشین قسم کا لنچ کسی بھی فٹ پاتھ کے ہوٹل سے مل جاتا ہے۔ وقت گذارنے کے لئے پہلی بتانے سے شغل جاری رہتا ہے۔ قابلیت بڑھانے کے لئے نایاب اور سستی کتابیں فٹ پاتھ پر مل جاتی ہیں۔ مختلف کھیل تماشے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ طبعیت خوش ہوئی تو کچھ دے لیا ورنہ لعنت ملامت کرتے آگے بڑھ گئے۔ مختلف دکانوں میں بھاؤ تاؤ کیا، سستے دام کچھ مل گیا تو خرید لیا۔ تھک گئے تو کسی جھاڑ کے نیچے بیٹھ گئے۔ بیمار ہیں تو کسی دواخانے سے رجوع ہوئے۔ پریشان ہیں تو نجومی کو ہاتھ دکھایا اور فٹ پاتھ پر دھونی جمائے کسی بابا سے دعا کے لئے کہا۔ بچوں کے لئے کھلونے خریدے۔ شام ہوئی اور تھکے ماندے گھر لوٹ آئے۔

ہمارے نزدیک فٹ پاتھ ملک کی شہری زندگی کا "نمائندہ مقام" ہے جہاں غریب عوام کی شہری زندگی نظر آتی ہے۔ کسی کو ہمارے ملک کی صحیح تصویر دیکھنی ہو تو گاؤں کی سیر کے ساتھ شہر کے فٹ پاتھ کی تفریح بھی کرنی چاہیئے۔

دسمبر۔ ۱۹۸۵ء

ٹرر ے فیک

عنوان پڑھنے میں آپ کو تکلیف اور جھنجھلاہٹ ہوئی ہوگی ۔ ہمارے مضمون کا عنوان " ٹریفک " ہے ۔ ہم نے دانستہ طور پر ٹریفک کو "ٹررے فیک " لکھا ہے تاکہ حیدرآبادی ٹریفک کی صحیح حرفی عکاسی ہوسکے ۔ غلط املا کی طرح ہمارے شہر کی ٹریفک بھی غلط ، تکلیف دہ ، مشکل ، بے ہنگم اور TERRIFIC (خطرناک) ہے ۔

تیز اور سبک رفتاری ٹریفک کی شان ہوتی ہے ۔ حیدرآبادی ٹریفک کی بات ہی کچھ اور ہے ۔ تیز رفتاری دور کی رہی ہماری ٹریفک کی کوئی رفتار ہی نہیں ہے ، تیز اور نہ ہی سست ۔ ہماری ٹریفک چلتی بھی نہیں بلکہ گرتے ، اٹھتے ، سنبھلتے اور آرام کرتے ہوئے رینگتی ہے اور اکثر اوقات رینگتے رینگتے تھک کر رک جاتی ہے ۔ ٹریفک رکنے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں ۔ اکثر و بیشتر ٹریفک بغیر کسی وجہ کے رک جاتی ہے ۔ ہمہ اقسام کی سواریاں مختلف سمتوں سے آپس میں بھڑ جاتی ہیں ۔ ہر ایک سواری جلد نکلنے کی کوشش میں پھنس کر رکاوٹ کا باعث بن جاتی ہے ۔ رکی ہوئی ٹریفک کو صاف کرنے کے لئے پولس کے جوان ہارن کے شور شرابے میں بے بسی اور لاچارگی سے سیٹیاں بجاتے ہوئے ڈنڈا گھماتے ہیں ۔ یہ منظر ہمیں گاؤں کی یاد دلاتا ہے جہاں بعض اوقات مختلف سمتوں سے آنے والی بھیڑ بکریوں کے جتھوں کی مڈبھیڑ ہوجاتی ہے ۔ مجبور و بے بس چرواہے آوازیں نکال کر انہیں الگ کر کے اپنی اپنی سمت لے جانا چاہتے ہیں ۔

جلوس ، بارات اور چار لوگوں کا مل کر ایک ساتھ چلنا ٹریفک کے لئے وبال جان ہوتا ہے ۔ چند ایک دلچسپ واقعات بھی ٹریفک کو مفلوج کر دیتے ہیں جیسے کابلی خاں کا قوت باہ کے لئے حلوہ بیچتے وقت لوگوں کا ہجوم اور کھیل تماشہ کرنے والوں کے اطراف بچوں کا جمع ہونا ۔ شادیوں کے موسم میں ٹریفک کی ناکہ بندی کی جاتی ہے ۔ وہ سڑک جسے آپ برسوں دفتر جانے کے لئے استعمال کرتے آرہے ہیں ، اچانک شامیانے میں غائب ہوجاتی ہے اور " آیا بنا آیا ہریالا بنا آیا " ریکارڈ آپ کی دلجوئی کرنے لگتا ہے ۔ شادی کی

تقریب میں شرکت کرتے ہوئے منزل کو جانا پڑتا ہے یا پھر کسی اور راستے سے اپنی منزل مقصود کو پہنچنا پڑتا ہے۔ ملازمین اپنے مطالبات منوانے کے لئے دفاتر کے آس پاس راستوں پر مظاہرہ کرتے ہوئے ٹریفک معطل کر دیتے ہیں۔ طلباء کا حال کچھ ان سے مختلف نہیں ہے۔ کلاس روم سے زیادہ وہ سڑکوں پر احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔

عام زندگی میں سوشلزم کا دور تک پتہ نہیں ہے۔ سوشلزم صرف ایک نعرہ ہے لیکن ہماری ٹریفک سوشلزم پر سختی سے عمل پیرا ہے۔ ہر قسم کی سواری کو یکساں عزت و آزادی حاصل ہے۔ بیل گاڑی کے پیچھے فیٹ کار بصد احترام رینگتی نظر آئے گی۔ ٹھیلے کے ساتھ قدم ملا کر کئی ٹن بوجھ اٹھائے لاری چلتی دکھائی دے گی۔ رکشا اور موٹر سیکل میں دوڑ ہوگی۔ ہم نے ایک مرتبہ پیادے کے پیچھے کار کو چلتے ہوئے دیکھا، ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی لڑکا کھلونا کار کھینچے چلا جارہا ہے۔ ہماری سوشلسٹ ٹریفک میں ہر قسم کی گاڑیاں تیز اور سست رفتار، نئی اور پرانی، آرام اور تکلیف دہ، مسافر اور مال بردار ایک ہی رفتار سے ایک ہی سڑک پر چلتی نظر آئیں گی۔ انسان اور جانور کا فرق بھی روا نہیں رکھا جاتا۔ انسان کے ساتھ جانور بھی ٹریفک کا حصہ ہوتے ہیں۔

ہماری ٹریفک شور شرابے والی ٹریفک ہے۔ پیادے سے لے کر ہر قسم کی سواری آواز کرتی ہے۔ بعض مرتبہ ٹریفک کی آواز پر صور اسرافیل کا گماں گزرتا ہے۔ گھبرا کر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ بیل گاڑی روڈ رولر کھینچتی چلی آرہی ہے۔ معمولی موٹر سیکل بھی ایسی آواز کرتی ہے جیسے مخالف ملک کا ٹینک دندناتا ہوا حملہ کرنے آرہا ہو۔ زوردار آواز سے کان کے پردے لرز اٹھتے ہیں۔ آس پاس کی عمارتیں کپکپا اٹھتی ہیں ماحول سے بے نیاز موٹر سیکل سوار ٹیپ سے انگریزی گانا سنتا اور سفر کا لطف اٹھاتا ہوا گذر جاتا ہے۔

ہماری ٹریفک کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ سواریاں چلتے ہوئے سڑک پر کچھ نہ کچھ چھوڑتی یا گراتی ہوئی جاتی ہیں۔ ہر سواری کم سے کم دھواں ضرور چھوڑتی ہے۔ بعض انجن پر گیاس پلانٹ کا گماں ہوتا ہے۔ آپ سے گذارش ہے کہ کبھی بھی سفید اور اجلے کپڑے پہن کر کھلے بندوں حیدرآبادی ٹریفک میں نہ نکلیں۔ ہم سے اس قسم کی غلطی ایک مرتبہ ہو چکی ہے۔ مینو پال کا اشتہار بنے ایک سواری کے پیچھے اتراتے چل رہے تھے کہ انجن نے دھواں چھوڑا۔ کھانستے ہوئے ہم غبار ٹریفک سے نکلے تو اپنوں نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ سفید کپڑے تو خیر سے سیاہ ہو چکے تھے، ہمارے چہرے کی رنگت بھی کئی دن تک تبدیل رہی۔ مال بردار گاڑیاں دھواں چھوڑنے کے علاوہ اپنے مال کا کچھ نہ کچھ حصہ سڑک پر گراتی ہوئی گزرتی ہیں جس سے پیچھے آنے والوں کو کرتب بازی کرتے ہوئے بچنا پڑتا ہے۔ چند سواریاں تیل گرا کر اپنے پیچھے آنے والی ٹریفک کو چاروں خانے چت کر دیتی ہیں۔

ہمارے شہر کی ٹریفک ممنوعہ کام کرنے پر مصر رہتی ہے۔ "نو پارکنگ" میں سواریاں ٹھہرائیں گے، غلط سمت سے راستہ چلیں گے، ممنوعہ سڑکیں استعمال کریں گے، منتخب جگہوں کو چھوڑ کر جہاں سے جی چاہے سڑک عبور کریں گے، ٹریفک سگنل پر توجہ نہیں دیں گے اور ہیلمٹ نہیں پہنیں گے۔ ٹریفک

کے اصولوں کی خلاف ورزی کو روکنے اور قانون پر عمل کروانے کے لئے ٹریفک پولس کا محکمہ ہوتا ہے ۔ ٹریفک پولس سیٹی بجاتی، ڈنڈے لہراتی اور چالان کرتے ہوئے بھی ٹریفک کو ممنوعہ کام سے باز رکھنے میں ناکام ہے ۔ اکثر "ٹریفک ویک" اور "ٹریفک پندرھواڑہ" منایا جاتا ہے ۔ پولس عوام سے التجاء کرتی ہے منت سماجت کرتی ہے ۔ انہیں یقین دلاتی ہے کہ پولس عوام کی دوست ہے اور وہ عوام کو سمجھانے اور منانے کے علاوہ غیرت دلانے کے لئے کمسن بچوں سے ٹریفک کنٹرول کرواتی ہے ۔ پھر بھی ہم نے کبھی نہ سدھرنے کی قسم کھا رکھی ہے ۔

ٹریفک نقطہ نظر سے ہم نے عوام کو دو طرح کے خیالوں کا حامی پایا ہے ۔ "ٹریفک برائے زندگی" اور "زندگی برائے ٹریفک" ۔ پہلے خیال کے حامی، محتاط ہوتے ہیں ۔ اپنی زندگی کو ٹریفک کے شر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ کم سے کم سفر کرتے ہیں ۔ ڈرائیونگ کے لئے دوسروں کی خدمات کو ترجیح دیتے ہیں ۔ ہمارے ایک دوست کو دفتر سے موپیڈ ملی تو انہوں نے اسے چلانے کے لے ذاتی خرچ پر ڈرائیور رکھا ہے ۔ موصوف ڈرائیور کے پیچھے سفر کرتے ہوئے ہدایات دیتے ہیں ۔ ٹریفک برائے زندگی قسم کے لوگ پیدل چلتے وقت بھی گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں ۔ چاروں طرف دیکھنے کے علاوہ اوپر بھی دیکھ کر گناہوں کی معافی مانگ لیتے ہیں ۔

"زندگی برائے ٹریفک" نقطہ نظر کے حامیوں کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل ہے ۔ زندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہیں جس سے خود ان کی اور دوسروں کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے ۔ تیز رفتاری اور بے توجہی سے کوئی حادثہ نہ ہوا تو اسے ڈرائیونگ کہتے ہیں جو ایک فن ہے ۔ حادثہ ہونے پر بدقسمتی پر محمول کیا جاتا ہے ۔

ٹریفک کی خطرناک خوبی حادثات ہیں ۔ بغیر کسی وجہ سے لے کر کئی وجوہات کی بنا پر حادثات وقوع پذیر ہوتے ہیں ۔ سڑک کے کنارے لگے پوسٹر ٹریفک کی توجہ بٹورتے ہوئے حادثے کا سبب بنتے ہیں ۔ ایک مرتبہ لاری ڈرائیور کی آنکھیں پوسٹر کو گھورتی رہیں، ذہن فلمی حسینہ میں الجھا رہا اور لاری سامنے کی دکان میں گھس پڑی تھی ۔ سوشلزم بھی حادثات کی ایک وجہ ہے ۔ ایک حادثے میں اسکوٹر سوار نے گدھے سے ٹکرا کر ہسپتال سے اوپر کی راہ لی جبکہ گدھا دولتی جھاڑتے ہوئے ٹریفک میں گم ہوگیا ۔ وجہ کچھ بھی ہو حادثے کا شکار زندگی بنتی ہے ۔ ٹریفک حادثات کی ترجمانی کے لئے ایک شعر تصرف کے ساتھ پیش خدمت ہے

یوں تو سفر حیات کا خاصہ طویل تھا
ہم ٹریفک کی راہ سے ہوکر گذر گئے

جون ۔ ۱۹۸۳ء

مت بجایئے

بجانے کے لے ڈھیر سارے ساز ہیں ۔ ڈھول طبلے سے لے کر الکڑانک ساز تک ، ایک طویل فہرست ہے ۔ ساز استعمال کرنا ایک فن ہے ۔ہارمونیم پر راگ وہی چھیڑ سکتا ہے جسے ہارمونیم بجانا آتا ہو ۔ طبلے پر استاد ہی ہاتھ مار سکتا ہے ۔ ستار وہی بجاسکتا ہے جسے ستار بجانے کا فن آتا ہو ۔ ہماری نظر میں ایک ساز ایسا ہے جسے بغیر مہارت بجایا جاسکتا ہے ۔ یہ ساز ہارن ہے ۔ ہارن بجانے کے لئے کسی فن اور ریاضت کی ضرورت نہیں ۔ صرف دبانا شرط ہے ۔ہارن کو کسی طرح بھی دبایئے پوں پوں یا بھوں بھوں کرتا ہے ۔ اسی آسانی کی وجہ سے ہارن حیدرآبادیوں کا پسندیدہ ساز بن چکا ہے ۔ سال کے بارہ مہینے، مہینے کے تیس دن، دن کے چوبیس گھنٹے ، گھنٹے کے ساٹھ منٹ اور ہر منٹ کے ساٹھ سکنڈ ہمارے شہر میں یہ ساز حسب مقدور بجتا رہتا ہے اور ہم جیسے ہارن بے زار لوگوں کو سر پر اولے پڑنے کا محاورہ یاد آتا ہے ۔

ہمہ اقسام کی گاڑیوں میں چاہے وہ ہاتھ گاڑی ہو کہ موٹر گاڑی ، نئی ہو کہ پرانی ، اچھی ہو کہ خراب ، ایک ہارن فٹ ہوتا ہے بلکہ بعض گاڑیوں میں صرف ہارن ہی ہوتا ہے ۔ میکانک گاڑی میں لگا ہارن بجاکر گاڑی کی بیماری کی تشخیص کرتے ہیں ۔ ایسے ہی ایک ماہر کا خیال ہے کہ اگر ہارن اچھا ہو تو بریک کی ضرورت نہیں پڑتی اور جس گاڑی کو چلاتے وقت کم سے کم بریک کا استعمال ہو ، وہ بہترین گاڑی ہوتی ہے ۔

ایمانداری سے اگر دیکھا جائے تو ہمارے شہر میں ہارن کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ سڑکیں اتنی " شاندار " ہیں کہ ان پر دوڑنے والی گاڑیوں کا پرزہ پرزہ ڈھیلا ہو جاتا ہے ۔ رہی سہی کسر میکانک پوری کر دیتے ہیں ۔ نتیجتاً ہمارے شہر کی گاڑیوں کا پرزہ پرزہ لرزہ براندام رہتا ہے ۔ گاڑی چلتے وقت پرزے سے پرزہ بجتا ہے ۔ مختلف آوازیں آتی ہیں ۔ شاک ابصار بر اور سیٹ سے چوں چوں چیں چیں ، انجن سے کھڑ کھڑ اور سیلنسر سے پھٹ پھٹ کی آوازیں اور سونے پہ سہاگہ سڑک پر موجود گڑھوں پر سے گذرتے وقت عجیب و غریب آوازیں آتی ہیں ۔ پتہ چل جاتا ہے کہ گاڑی آرہی ہے ۔ہارن کی چنداں ضرورت نہیں پڑتی ، لیکن

صاحب ہمارے ذوق کی داد دیجئے ہم گاڑی سے آنے والی مختلف آوازوں سے اونچا بجنے والا ہارن لگاتے ہیں ۔ شفیق الرحمن نے ایک کار کی تعریف میں لکھا تھا کہ اس کا ہر پرزہ سوائے ہارن کے بجتا تھا ۔ ہماری گاڑیوں کے کل پرزے ہارن سمیت کورس میں ایسے بجتے ہیں کہ ایک سماں بندھ جاتا ہے ۔ اگر ڈرائیور کو موسیقی سے لگاؤ ہے تو پھر کیا کہنے ۔ گاڑی میں ٹیپ ریکارڈ نصب ہوتا ہے ۔ گاڑی کے پرزوں، ہارن اور ٹیپ ریکارڈ کے بجنے سے سڑک میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے ۔ پیدل راہ گیروں کو لگتا ہے پیروں تلے زمین سرک رہی ہے ۔

کمزور بینائی، دور یا قریب کی نظر کے لئے دو مختلف عینکیں ہوتی ہیں ۔ اسی طرح ہارن بھی دو قسم کے ہوتے ہیں ۔ دور اور قریب سے بجانے کے لئے الگ الگ ہارن ایک ہی گاڑی میں لگے ہوتے ہیں ۔ دور سے بجنے والے ہارن کی آواز تیز ہوتی ہے ۔ اس کا استعمال شہر میں ممنوع ہے لیکن ہمارے شہر میں یہی ہارن بجتا ہے ۔ بجانے والے کہتے ہیں کہ شہر میں آوازیں بہت آتی ہیں، اسی لئے ہارن کی آواز تیز ہونی چاہیئے ۔ نزدیک کا ہارن بہت کم بجایا جاتا ہے ۔ یوں سمجھیئے ٹکر مارتے وقت یا ٹکر مارنے کے بعد بجتا ہے ۔ اکثر ڈرائیور دونوں ہارن ایک ساتھ استعمال کرنے کو ترجیح دیتے ہیں ۔

چھوٹی، بڑی گاڑیوں کو مختلف قسم کی روشنی اور ہارن سے سجانا فیشن ہے ۔ بعض لوگ گاڑیاں صرف اس شوق کو پورا کرنے کے لئے رکھتے ہیں ۔ راستے سے گزرتے وقت ایسی گاڑیاں راہ گیروں کی توجہ مبذول کر لیتی ہیں ۔ ہمیں محسوس ہوا کہ لوگ بحالت مجبوری گاڑی اس لئے چلاتے ہیں کہ وہ سواری ہے، اگر ان کا بس چلتا تو ہیڈ لائٹ اور دوسری بتیاں روشن کئے، گاڑی کو بقعہ ۔ نور بنائے ہارن بجاتے ہوئے اسے گود میں اٹھائے خود سڑکوں پر دوڑتے پھرتے ۔

ٹریفک رکنے پر ہارن بجانے کا مقابلہ منعقد ہوتا ہے ۔ مختلف النوع گاڑیاں ایک دوسرے میں گھس کر میں میں اور پیں پیں کرنے لگتی ہیں ۔ ہمارے ایک لیڈر دوست نے اس پر یوں اظہار خیال کیا "ٹریفک میں بے قاعدگی کے خلاف احتجاجاً ہارن بجایا جاتا ہے ۔ " ہم نے کہا" بھائی خاموشی سے بھی تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے ۔ "انہوں نے جواب دیا" خاموشی مسائل پیدا کرتی ہے اور احتجاج ان کا حل ہے ۔ " ٹریفک جام ہونے پر بجنے والے ہارن کے تعلق سے ہمارے ایک شاعر دوست عرض کرتے ہیں " وقت گذاری کے لئے مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے ۔ کسی ہارن کی بحر چھوٹی ہوتی ہے تو کوئی ہارن بڑی بحر میں بجتا ہے ۔ کوئی ہارن تحت میں تو کوئی ترنم میں بجتا ہے ۔ کوئی ہارن قصیدہ تو کوئی ہارن مرثیہ سناتا ہے ۔ "

گاڑی بڑھانے کے لئے اکسیلیٹر دبایا جاتا ہے ۔ روکنے کے لئے بریک لگایا جاتا ہے ۔ انجن کو قابو میں کرنے کے لیے کلچ اور رفتار کے لئے گیروں کا استعمال ہوتا ہے ۔ ان چار پرزوں سے گاڑی چلتی ہے، دوڑتی ہے اور رکتی ہے ۔ اسے چلانے کے لئے ہارن کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ گاڑی کے لئے ہارن غیر ضروری بلکہ چھٹی انگلی کی طرح ہے ۔ بعض لوگ صرف ہارن بجانے کے شوق میں گاڑی چلاتے ہیں ۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے کے ساتھ ہی ہارن بجاتے ہیں ۔ ہارن کی آواز سن کر لوگ ان کے لئے راستہ دیتے ہیں ۔ گویا ہارن نہ ہوتا تو ایسے حضرات گاڑی نہیں چلا سکتے تھے ۔

شہر میں چند علاقے ایسے ہوتے ہیں جہاں ہارن بجانا ممنوع ہے ۔ دواخانے اور اسکول کے قرب و جوار میں ہارن بجانا منع ہے لیکن ہمارے شہر میں ان علاقوں میں بھی ہارن بجتا ہے ۔ ہم اپنے ایک دوست کی گاڑی میں بیٹھے دواخانے کے پاس سے گزر رہے تھے ۔ ہارن نہ بجانے کی ہدایت کے باوجود ہمارے دوست مسلسل ہارن بجائے جارہے تھے ۔ ہم نے انہیں ٹوکا تو فرمایا "ہارن بجانا اس لئے ممنوع ہے کہ ایکسیڈنٹ کی صورت میں دواخانہ قریب ہے لیکن میں ہارن اس لئے بجارہا ہوں کہ ایکسیڈنٹ کی نوبت ہی نہ آئے ۔"

باہر سے آئے ہوئے ہمارے ایک دوست نے شہر میں مسلسل ہارن بجتے ہوئے سن کر کہا " باہر ہارن بجانا معیوب سمجھا جاتا ہے ۔ کسی پر یوں ہی ہارن بجانا اس کی غیرت کو للکارنا ہے ۔ لڑائی جھگڑے کی نوبت آجاتی ہے ۔ مختلف رفتار کے لئے سڑک کے مختلف حصے ہوتے ہیں ۔ بغیر ہارن بجائے مقررہ رفتار پر گاڑی چلائی جاتی ہے ۔ " ہم نے انہیں سمجھایا " بھائی ہمارا ملک غریب ہے ۔ ہماری سڑک کے حصے نہیں ہوسکتے تمام سواریاں مل جل کر سکیولر طریقے سے چلتی ہیں ۔ یکجہتی اور یگانگت کے اظہار کے لئے ہارن بجائے جاتے ہیں ۔"

ہم ہارن کی بے وجہ راگنی سے پریشان رہتے ہیں ۔ ہارن کی وجہ سے سفر کا لطف بھی اٹھانے سے قاصر ہیں ۔ ایک مرتبہ سفر کا لطف اٹھانے کی کوشش میں گنگناتے ہوئے جارہے تھے کہ پیچھے سے زور دار ہارن بجا ۔ ہم پریشان ہوکر تھرتھرانے لگے ۔ سنبھل کر دیکھا تو ایک چھوٹی اور ننھی منی سیکل پر ایک نحیف و ناتواں شخص سفر کررہا ہے ۔ یہی ہارن موصوف کی بے خیالی میں یوں بجتا تو ہمیں یقین ہے کہ ان کی روح پرواز کرجاتی ۔

مضمون پڑھ کر آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ ہم ہارن زدہ ہیں ۔ ہم چاہتے ہیں کہ شہریوں سے درخواست کریں " خدارا ۔ ہارن مت بجائیے " لیکن خیال آتا ہے کہ جس نقار خانے میں ہارن پوری آواز کے ساتھ بجتے ہیں وہاں طوطی کی کون سنے گا ۔

مئی ۔ ۱۹۸۶ء

حیدرآبادی نل

انسانی زندگی کادار و مدار ہوا، پانی اور غذا پر ہے۔ ہوا پہلے مفت ملا کرتی تھی سو آج بھی مفت ہے لیکن آج کی ہوا پچھلے زمانے کی ہوا جیسی پاک و صاف اور تر و تازہ نہیں ہے۔ آج ہوا ہر طرح سے آلودہ ہے۔ کارخانوں اور موٹروں سے خارج شدہ دھوئیں سے لے کر فرقہ واریت کا زہر تک اس میں ملا ہوا ہے۔ غذا پہلے مفت تھی اور نہ آج ہے۔ غذا حاصل کرنے کے لئے خود یا خود کے لئے کسی دوسرے کو محنت کرنی پڑتی ہے۔ پانی کا مسئلہ مختلف ہے۔ کسی زمانے میں پانی مفت ملا کرتا تھا۔ جوں جوں انسان ترقی کرتا گیا پانی بکنے لگا۔ آج بھی جہاں انسانی تہذیب ترقی پذیر نہیں ہے وہاں پانی مفت ملتا ہے۔ دیہاتوں میں ندی، نالوں اور کنوؤں کا پانی بلا قیمت حاصل ہوتا ہے۔ یہی پانی جب شہر کے تہذیب یافتہ ماحول میں پہنچتا ہے تو بکنے لگتا ہے شہروں میں بہ اہتمام نل کے ذریعہ پانی پہنچا کر اور پانی کے خرچ کو ناپ تول کر قیمت وصول کی جاتی ہے۔

دوسرے شہروں کی طرح ہم حیدرآبادیوں کو بھی پانی نل کے ذریعہ مہیا کیا جاتا ہے۔ جب ہم حیدرآبادی نل کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہماری ناک میں گدگدی ہونے لگتی ہے۔ ہاتھ بے ساختہ ناک کی جانب چلا جاتا ہے۔ انسانی ناک اور حیدرآبادی نل میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں، سال کے ایک طویل عرصے تک خشک رہتے ہیں۔ موسم گرما کے چھ ماہ ہمیں نہ سردی زکام ہوتا ہے اور نہ ہی ہمارے نل سے پانی آتا ہے۔ بارش کے موسم میں سردی زکام سے ناک بہنے لگتی ہے تب نل میں بھی پانی آتا ہے۔ اکثر اوقات انسانی ناک حیدرآبادی نل کو مات دے دیتی ہے۔ ناک ندی کی طرح بہہ نکلتی ہے۔ نل سے کبھی پانی بہتا نہیں بلکہ ٹپکتا اور رستا رہتا ہے۔ بارش کے تین ماہ نل سے پانی آتا ہے۔ بارش کے بعد سرما کے تین ماہ ہر دو کے لئے بھاری ہوتے ہیں۔ سردی زکام کی شدت سے ناک بند رہتی ہے۔ اسی طرح نل بھی ہم سے روٹھ جاتے ہیں۔ انسانی ناک اور حیدرآبادی نل میں موجود مماثلت سے ہمیں سہولت حاصل ہے۔ اپنی ناک کی کیفیت سے نل کی حالت کا اندازہ لگالیتے ہیں۔ ناک اور نل کی ملی جلی کیفیت سے ہم موسم کے

بارے میں جانکاری بھی حاصل کرلیتے ہیں۔ہماری موسمی پیش قیاسی اکثر صحیح ثابت ہوتی ہے۔

نل کے ساتھ میٹر لگا ہوتا ہے۔ پانی پہلے میٹر سے گزرتا ہے پھر نل سے ٹپکتا ہے۔ میٹر پانی کا غلط حساب رکھتا ہے۔ پانی آئے یا نہ آئے میٹر بہر حال پانی کا خرچ بتلاتا ہے۔ پانی کی قیمت ٹیکس کے نام سے ادا کرنی پڑتی ہے۔ پانی کی قیمت کے بجائے ٹیکس وصول کرنے میں ایک نکتہ ہے۔ استدلال ہوتا ہے کہ پانی کی قیمت وصول نہیں کی جارہی ہے بلکہ پاک و صاف پانی کو سلیقے سے سربراہ کرنے کا ٹیکس لیا جارہا ہے۔ پاک و صاف پانی کسے کہتے ہیں، اس کا اندازہ شاید ٹیکس وصول کرنے والوں کو نہیں ہے۔ حیدرآبادی نل سے آنے والا پانی، پانی نہیں ہوتا بلکہ مختلف رنگوں کا سیال ہوتا ہے جسے مجبوراً پانی اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ وہ نل سے آتا ہے بارش کے موسم میں چاکلیٹی، لال اور پیلے رنگ کا پانی آتا ہے تو بعض مرتبہ کائی ملے ہرے اور نیلے رنگ کا پانی بھی سربراہ کیا جاتا ہے۔ رنگین پانی میں خوردبینی مخلوق سے لے کر بحری مخلوق تک موجود رہتی ہے۔ ایک مرتبہ رات کے کھانے میں، بیگم نے تازے جھینگوں کے سالن کا سرپرائز دیا۔ اصرار کے بعد راز کھلا کہ دوپہر نل کی راہ چند جھینگے ٹپک پڑے تھے۔

نل کے پائپ دشوار کن مرحلوں سے گذر کر صارفین تک پہنچتے ہیں۔ موریوں سے گزرتے ہیں۔ برقی کے تاروں سے دشمنی مول لیتے ہیں۔ ٹیلیفون کے تاروں سے دوستی کرتے ہیں۔ مٹی اور پتھروں کا بوجھ اٹھائے، ٹوٹتے، پھوٹتے اور زنگ کھاتے ہوئے ہم کو پانی کے ساتھ چند خطرناک اور دلچسپ چیزیں بھی پہنچاتے ہیں۔ موریوں سے گندگی، غلاظت اور بیماریاں صارفین میں پھیلاتے ہیں۔ بعض وقت نل کے پائپ میں پانی کے بجائے برقی بہنے لگتی ہے۔ ان دو صورتوں میں نل خطرناک اور جان لیوا بن جاتا ہے۔ نل کو دیکھتے ہی کپکپی طاری ہوتی ہے۔ نل کے پائپ ٹیلیفون کے تار سے ان کی گفتگو چرا کر صارفین کا دل بہلاتے ہیں۔ ہمارے گھر کے نل سے بعض مرتبہ ریڈیو سیلون اور دودھ بھارتی کے پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں۔ مضمون لکھتے وقت

پانی رے پانی تیرا رنگ کیسا
جس میں ملا دو لگے اس جیسا

گانا نل پر بج رہا تھا۔ نل پر جب ظلم برداشت سے باہر ہوتا ہے تو وہ تمام بندشیں توڑ کر زمین کی سطح پر پانی انڈیلنے لگتا ہے۔ پائپ کے راستے سیلاب آجاتا ہے۔ گھروں میں پانی کا کال پڑ جاتا ہے اور نل سے عجیب و غریب آوازیں آنے لگتی ہیں۔

گاؤں میں زراعت کا انحصار مانسون پر ہوتا ہے۔ ایسے ہی شہر میں پانی کی فراہمی مانسون پر منحصر ہوتی ہے۔ طاقتور مانسون نل میں پانی بہالاتے ہیں۔ ہر سال، ہم طاقتور مانسون کے لئے دعا کرتے ہیں لیکن مانسون تو مانسون ہیں، کسی کی مانتے ہیں اور نہ کسی کی سنتے ہیں۔ اپنی مرضی میں جو آئے وہی کرتے ہیں۔ چند سال میں ایک مرتبہ طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بقیہ وقت رسماً چلے آتے ہیں۔ پانی کی فراہمی کی ذمہ داری محکمہ آبرسانی کے سپرد ہے۔ یہ محکمہ مانسونی بارش کو تالابوں میں جمع کرکے شہریوں تک پانی پہنچاتا ہے۔ اسی لئے

ابر، برسات اور پانی کو ملا کر اس محکمہ کا نام "محکمہ آبرسانی" رکھا گیا ہے۔

نل سے پانی ہر وقت نہیں آتا۔ دن میں ایک وقت چند منٹوں کے لئے آتا ہے۔ نل کے کھلنے اور بند ہونے کا وقت مقرر ہے لیکن کبھی بھی وقت کی پابندی نہیں کی جاتی۔ کسی وقت بھی نل سے پانی ٹپکنے لگتا ہے۔ ہم چوبیس گھنٹے نل کھلا رکھے، نیچے برتن رکھے، مصلے بچھائے پانی کی رحمت کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں۔ ایک شان بے نیازی سے نل کھلتا ہے۔ چند قطرے پانی ٹپکاتا اور سیٹی بجاتا ہوا بند ہو جاتا ہے۔ کسی وقت نل دادا جان کے حقہ کی طرح صرف گڑ گڑا کر ہوا اور دھواں خارج کرتا ہے۔

نل سے پانی حاصل کرنے کے لئے ہم چند حربے آزماتے ہیں۔ نل کو زمین سے فٹ، دو فیٹ اونچا رکھنے کے بجائے زمین میں گڑھا بنا کر رکھتے ہیں تاکہ نیچے پانی پریشر سے جلد آئے بعض گھروں میں نل کے لئے تہہ خانے بنے ہوئے ہیں۔ چند حضرات نل کو پمپ لگا کر آس پاس کے گھروں کا پانی کھینچ لیتے ہیں۔ کوششوں سے ہر دن صرف اتنا پانی حاصل ہوتا ہے جس سے کوئی ایک کام ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ ہم اپنے گھر کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ہر کام کے لئے ہفتے میں ایک دن مقرر ہے۔ بچوں کے نہلانے کا دن، بڑوں کے نہانے کا دن، برتن دھونے کا دن، بچوں کے کپڑے دھونے کا دن، بڑوں کے کپڑے دھونے کا دن اور نل بند رہنے کے دو دن جب نہانے دھونے کو چھٹی ہوتی ہے۔

نل کی ایک دلچسپ اور خطرناک صورت پبلک نل ہے۔ پبلک نل پر آس پاس کے گھروں کی اجارہ داری ہوتی ہے۔ پانی حاصل کرنے کے لئے لوگوں کے بجائے برتنوں کی قطار لگتی ہے۔ پانی کے انتظار میں ملک سے لے کر محلہ کی سیاست پر بحث ہوتی ہے۔ انفرادی، گروہی اور فرقہ واری جھگڑے بھی یہیں شروع ہوتے ہیں۔

قصہ مختصر ہمارے لئے نل کی اہمیت پانی تک محدود نہیں ہے۔ پانی کے علاوہ نل سے دیگر باتیں بھی وابستہ ہیں۔ اس صورت حال کی ترجمانی شاید اس شعر سے ہوتی ہے جسے ہم نے ایک رکشہ کے پیچھے سے نوٹ کیا تھا۔

اللہ رے کیا ہے گرانی
سستا خون تو مہنگا ہے پانی

اکتوبر - ۱۹۸۳ء

قلت آب

سمجھ میں نہیں آتا ہم حیدرآبادیوں کو نئے سال کی مبارک باد پیش کریں یا پانی کی قلت پر پرسہ دیں ۔ ایک صاحب کو ہم نے نئے سال کی مبارک باد دی ۔ " نیا سال مبارک ہو ۔ نیا سال آپ کی زندگی میں خوشیاں لائے ۔ " یہ سن کر انہوں نے ہمیں نصیحت کی "میاں لگتا ہے تم گھر کا کام کاج نہیں کرتے ۔ پانی کی تلاش میں گھڑا لے کر گلی گلی بھٹکتے ہوتے تو نئے سال کی مبارک باد نہیں دیتے اور اگر دینا ہی تھا تو کہتے " نیا سال آپ کی زندگی کے لئے ہر دن ایک گلاس پانی پلائے ۔ " اس تجربے کی روشنی میں ہم نے دوسرے صاحب سے کہا "نئے سال کی ابتداء قلت آب سے ہوئی ہے ۔ انتہا کیا ہوگی ۔ سوچ کر اختلاج ہونے لگتا ہے ۔ " انہوں نے ہمیں ٹوکا "نئے سال کی ابتداء ہی میں کیوں بدشگونی کرتے ہو ۔ چلو میں تمہیں دو گلاس پانی پلاتا ہوں ۔ " تنگ ہو کر ہم نے چپ سادھ لی ۔ کسی نے نئے سال کی مبارک باد دی تو "آپ کو بھی سلامت " کہا اور جب کسی نے قلت آب کا تذکرہ کر کے اشک بہائے تو ہم نے اشک پی لئے مبادا پانی ضائع نہ ہو جائے ۔

پانی کی قلت یوں یکلخت شروع نہیں ہوئی ۔ مانسونی بارش دغا دے گئی ۔ دور دراز مقامات سے ندی اور نالوں کی بدولت جو پانی بہہ کر آتا تھا وہ نہیں آیا ۔ نل سے دن میں دو مرتبہ کے بجائے صرف ایک وقت پانی آنے بلکہ رسنے لگا ۔ قلت آب مزید بڑھی تو دو دن میں ایک مرتبہ نل کھلنے لگا ۔ ہمارے ایک دوست نے بتلایا کہ وہ تین دن میں ایک بار پانی کشید کر رہے ہیں ۔ اندازہ ہے کہ مستقبل میں یہی کام ہفتے میں ایک مرتبہ اور پھر پندرہ دن میں ایک مرتبہ کرنا پڑے گا ۔ دو دن قبل ہم ایک عزیز کے گھر گئے ۔ انہوں نے بتلایا " ہمارے گھر کے نل سے کبھی ماضی بعید میں ONCE UPON A TIME پانی آتا تھا ۔ اب تو نل شہری آرائش کی زینت بنا اس طرح کھڑا ہے کہ اس کے سائے سے استفادہ ممکن ہے اور نہ ہی مایوس ہو کر نل سے لٹک سکتے ہیں ۔ پانی کی آس میں نل کا قد گھٹتے گھٹتے ٹخنوں کے برابر ہو چکا ہے بلکہ ہمارے پڑوسی کا نل تو " مدفون " بھی ہو چکا ہے ۔ "

پانی کے حصول کے لئے جن مصیبتوں کا سامنا ہوتا ہے اس سے شہری زندگی ناآشنا تھی ۔ گھر بیٹھے نل کھولا کہ پانی آیا ۔ اب ہمیں پتہ چلے گا کہ پانی کیسے حاصل ہوتا ہے ۔ کنویں سے پانی کیسے سینچا جاتا ہے ۔ پانی کو گھڑوں میں بھر کر سر یا کمر پر اٹھائے کیسے ڈھویا جاتا ہے ۔ ایسے مناظر ہم فلموں میں دیکھتے تھے ۔ پنگھٹ سے گوری پانی کا گھڑا اٹھائے اٹھلاتی آرہی ہے ۔ شہری بابو ہیٹ پہنے لکڑی گھماتے مخالف سمت سے آتے ہوئے گوری سے ٹکرا جاتے ہیں ۔ گھڑا ٹوٹا ، دل جڑے اور بعد میں پھر ٹوٹے ۔ ایسے مناظر چند تبدیلیوں کے ساتھ اب شہر میں نظر آئیں گے ۔ گاؤں کی ہری بھری پگڈنڈی کے بجائے شہر کی پکی سڑک ہوگی ۔ کسی سے ٹکرانے کے بجائے گڑھے میں گر کر چاروں خانے چت ہوں گے ۔ گھڑے کے ساتھ ہڈی بھی ٹوٹے گی ۔

شہر میں جسے دیکھئے پانی کے حصول کے لیئے سرگرم عمل ہے ۔ سڑکوں پر شہری بابو سوٹ بوٹ پہنے سیکل پر بکیٹ لٹکائے اور گھڑے اٹھائے پانی لارہے ہیں ۔ چند دن قبل ہم نے اپنے آفیسر کو بنین اور لنگی پہنے ایک ہاتھ میں بکیٹ اٹھائے کن کھاتے ہوئے دیکھ کر سلام کیا تھا ۔ اس دن کے بعد سے انہوں نے دفتر دیر سے آنے کی وجہ نہیں پوچھی ۔ گھر کے سارے افراد حسب استطاعت گھڑا ، بکیٹ ، ٹھلیا ، لوٹا یا گلاس اٹھائے پانی کے لئے نکل پڑتے ہیں ۔ بیگم کے جہیز میں جو دیگچوں کا خاندان دیا گیا تھا اس کا صحیح مصرف اب ہماری سمجھ میں آیا ہے ۔ ہمارے ذمہ پچاس سیر کا دیگ ، بیگم کے حصہ میں تیس سیر کا دیگ اور سب سے چھوٹی لڑکی کے ذمہ پاؤ سیر کی دیگچی بھر کر پانی لانا ہے ۔

پانی کی قلت ایک سیاسی مسئلہ بن گئی ہے ۔ برسراقتدار اور اپوزیشن پارٹیاں ایک دوسرے کو پانی کی قلت کا ذمہ دار گردانتے لگی ہیں ۔ پانی مہیا کرنا انتخابی مہم کا وعدہ ٹھہرا ۔ کسی امیدوار کا انتخابی نشان گھڑا ہے تو کسی کا بورویل ۔ پانی کی قلت کی طرف توجہ دلانے کے لئے خالی گھڑوں اور خالی گلاسوں کے جلوس نکالے جانے لگے ۔ ہر پارٹی پانی مہیا کرنے کے لئے ایک اسکیم پیش کرتی ہے ۔ دور کی کوڑی کی طرح کوئی اس ندی سے تو کوئی اس دریا کا پانی شہر میں بہالانے کا پروگرام بناتا ہے ۔ عوام تقاریر سنتے اور اپنی پیاس بجھانے پانی کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں ۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سیاسی قائد " پانی پارٹی " شروع کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں ۔ آئندہ مانسون تک پارٹی تشکیل پا جائے گی ۔

سیاسی قائدین جہاں پانی کی قلت کو مسئلہ بنا کر اپنی دکان چمکانے لگے وہیں دانشور حضرات پانی کے تعلق سے معلومات بہم پہنچا کر رعب جھاڑنے لگے ۔ ایک فرد کے لئے دن میں تیس گیلن پانی چاہیئے ۔ اگر وہ اپنی ضروریات میں کٹوتی کرے تو کم از کم بیس گیلن پانی درکار ہے ۔ دانشور حضرات اس مقدار سے کم پانی کا راشن متعین کرنے تیار نہ تھے ۔ ہم نے کہا "بھائی ۔ ہماری ضرورت بہت کم ہے ۔ پینے کے لئے ایک لیٹر ، وقت ضرورت " آدھا لیٹر ، پکوان کے لئے پاؤ لیٹر اور ہفتے میں پانچ لیٹر نہانے اور کچھ کم اتنی ہی مقدار کپڑے دھونے کے لیئے پانی چاہیئے ۔ یومیہ ایک گیلن پانی میں ، ہم جی لیں گے ۔ " دانشور صاحب نے فرمایا " ترقی یافتہ ممالک کا ہر فرد یومیہ ایک گیلن پٹرول جلاتا ہے ۔ ہمیں تو یومیہ چالیس گیلن پانی چاہیئے ۔ " ہمیں آج تک یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ ہم کسی بات کی اہمیت جتانا چاہتے ہوں تو اس کا مقابلہ ترقی یافتہ ممالک سے کیوں

کریں ۔ ہم اپنی ناسمجھی پر خاموش ہو رہے ۔

پانی کی قلت ہو اور صحافت خاموش رہے، صحافت میں اتنی قوت ہے کہ وہ رائی کو پربت اور پربت کو رائی بنا سکتی ہے ۔ پانی کی قلت کے ساتھ شہر کے اخباروں میں مختلف خبریں چھپنے لگیں ۔ "لوگ خالی گھڑے اٹھائے پانی کی تلاش میں نکل پڑے ۔ " "ہوٹلوں میں پانی سپلائی کرنے کے گلاس چھوٹے ہو گئے ۔" "فلاں محلے کے لوگ پچھلے ایک ماہ سے پانی کی بوند بوند سے محروم ۔" "پانی کے لئے خون بہا ۔" "دعوتوں میں ہاتھ دھلانے کے بجائے کاغذ کے نیپکن کی فراہمی" ۔ ہر دن ایک نئی چونکا دینے والی سرخی ۔ بر سبیل تذکرہ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ اردو اخبارات میں اگر پڑھنے کی کوئی چیز ہوتی ہے تو وہ ہیں سرخیاں ۔ اخبارات میں پانی کی قلت کی خبروں کے ساتھ تصاویر بھی شائع ہونے لگیں ۔ پانی حاصل کرنے کے لئے عوام اور خالی برتنوں کی قطار، عوام سوکھے تالاب میں باولیاں کھودتے ہوئے اور بورویل سے پانی رستا ہوا ۔

پانی کی قلت سے جہاں ہر کوئی متاثر ہوا، وہیں ادیب اور شاعر اپنا دامن کیسے بچا سکتے ہیں ۔ پانی کی قلت پر نظمیں، قطعات اور مرثیے لکھے جانے لگے ۔ افسانوں کے پلاٹ انوکھے بلکہ تجسس آمیز ہو گئے ۔ مزاحیہ ادیب پانی کی قلت کو طنز و مزاح کی عینک لگا کر دیکھنے لگے ۔ یوں موضوعاتی ادب کو فروغ حاصل ہوا ۔ ہمارے ایک ساتھی نقاد نے ہم سے کہا "اب تمہیں ایک اور موضوع ہاتھ لگا ہے ۔ بینڈ کوں کی طرح ٹرانا اچھا نہیں لگتا ۔ تحریریں زندہ جاوید ہونی چاہئیں ۔" ادب برائے زندگی یا ادب برائے ادب پر پھر سے بحث شروع ہو گئی لیکن مباحث مختصر ہونے لگے ۔ بحث میں ہونٹ، منہہ اور حلق خشک ہوتے ہیں جنہیں تر کرنے کے لیے پانی چاہیئے ۔

شہری زندگی "کیو لائف" یعنی قطار کی زندگی ہے ۔ عمر عزیز کا زیادہ تر حصہ مختلف قطاروں میں ٹھہرتے گذرتا ہے ۔ راشن، کیروسین، دودھ، تیل وغیرہ مختلف کیو میں ٹھہر کر حاصل کئے جاتے ہیں ۔ قطار کی فہرست میں پانی کی کیو کا اضافہ ہوا ۔ قطار میں کھڑے ٹینک کے ذریعہ پانی کی آمد یا نل کھلنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے ۔ قطار میں خود کھڑے ہونے کے بجائے برتن کو کھڑا کیا جاسکتا ہے ۔ برتن کھڑا کرنے سے پھلانگ کر آگے جانے، ایک دوسرے کو آپس میں رگڑنے اور بحث و مباحثہ بلکہ لڑائی جھگڑا کرنے کی زحمتوں سے محروم رہتے ہیں ۔ ہمیں تو محسوس ہوتا ہے کہ پانی کے لئے بھی راشن کارڈ بنوانا پڑے گا ۔ دودھ کی طرح پانی بھی لیٹر اور آدھے لیٹر کی پیکٹوں اور بوتلوں میں دستیاب ہو گا ۔ حکومت اس کے لئے بھی کوئی کارپوریشن تشکیل دے گی ۔

پانی کی قلت زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوئی ہے ۔ دعوت ناموں پر گذارش درج ہے " براہ کرم اپنا پانی ساتھ لائیں ۔ ہم آپ کے لئے بریانی، برہانی، بگھارے ٹماٹر، مرغ مسلم، سیخ کباب، شیرمال، خوبانی کا میٹھا اور گل فردوس تیار رکھیں گے ۔" ہمارے ایک ساتھی کو اندیشہ ہے کہ پانی کی قلت کا فائدہ اٹھا کر ہوٹل والے پانی کی قیمت وصول نہ کرنے لگیں ۔ پانی پر سیلس ٹیکس عائد ہو جائے گا ۔ جلسے اور میٹنگس میں قبل از وقت اعلان کر دیا جائے گا کہ پانی پلانے کی ذمہ داری منتظمین پر نہ ہوگی ۔ اشتہارات

میں لکھا ہوگا "پچاس روپیہ کی خریدی پر ایک گلاس اور سو روپیہ کی خریدی پر تین گلاس پانی مفت پیش کیا جائے گا۔"

گنڈی پیٹ کا پانی پینے میں حیدرآبادی فخر محسوس کرتا ہے۔ اس پانی سے ہاضمہ ٹھیک رہتا ہے۔ بھوک کھل کر لگتی ہے۔ طبعیت بحال رہتی ہے۔ اب گنڈی پیٹ کا پانی کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔ ہر محلہ اور گلی کا اپنا ایک کنواں ہے۔ جس طرح لوگ مختلف چکیوں کا پسا آٹا کھاتے ہیں اسی طرح لوگ اب مختلف بورویل کا پانی پینے لگے ہیں۔ کسی محلہ کا پانی کھارا ہے تو کسی کا میٹھا۔ کوئی پانی قبض کشا تو کوئی قبض آور کہیں پانی سے رنگ ماند پڑرہا ہے تو کہیں حسن میں چار چاند لگ رہے ہیں۔ قابل رشک صحت دیکھ کر پوچھا جائے گا "آپ کہاں کا پانی پیتے ہیں اور کس چکی کا پسا آٹا کھاتے ہیں۔" پانی کی قلت کے پیش نظر اب حیدرآبادیوں کو گنڈی پیٹ کے بجائے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینا پڑرہا ہے۔

پانی کی قلت کے کچھ فوائد بھی ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ شہر میں کیچڑ نہ ہوگا۔ ہمارے شہر میں بلدی سہولتیں کیچڑ پیدا کرنے کے لئے ہیں۔ پانی کی قلت سے سڑکوں، گلیوں اور کوچوں میں کیچڑ پیدا نہ ہوگا۔ ہم امید کرسکتے ہیں کہ گوالے پہلی مرتبہ خالص دودھ بیچیں گے، انہیں ملانے کے لئے پانی نہ ملے گا۔ کبھی کبھار نہانے والے اب دھڑلے سے پانی کی قلت کا عذر کرسکتے ہیں۔ ایک صاحب نے ہم پر طنز کیا "میاں اب روز کیسے نہاؤگے۔ ڈرائی کلینگ کروانی پڑے گی۔"

پانی کی قلت کب تک رہے گی۔ اس سوال کا جواب ہم زمین والوں کے پاس نہیں ہے۔ آسمان سے پانی برسے گا تب ہی پانی کی فراوانی ہوگی۔ پھر کیوں نہ ہم اوپر والے سے دعا کریں کہ وہ جلد سے جلد مینہہ برسائے۔ کہیئے۔ آمین۔

فروری۔ ۱۹۸۶ء

مجسمے ہی مجسمے

پچھلے چند سال سے ہماری حکومت جو بھی قدم اٹھاتی ہے، اس پر اختلافی بحث شروع ہو جاتی ہے اور پھر بحث موافق اور مخالف احتجاج کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ وظیفے پر سبکدوشی کی عمر میں کمی، تحفظات میں اضافہ، پانچ دن کا ہفتہ اور ہیلمٹ کا لزوم، یہ چند حالیہ مثالیں ہیں۔ اس سلسلے کی ایک تازہ کڑی حسین ساگر کٹے پر مجسموں کی تنصیب ہے۔ لاکھوں بلکہ کروڑہا روپیوں کی لاگت سے حسین ساگر کٹے کو کشادہ کرنے اور سڑک کے ایک کنارے مجسمے نصب کرنے کا کام شروع کیا گیا۔ عوام میں اختلافی بحث و مباحث کا آغاز ہوا کوئی مجسموں کی تنصیب کا حامی ہے تو کوئی مخالف، کہتے ہیں اختلافی بحث اور پھر اکثریت کا فیصلہ جمہوریت کی شان ہے۔ یہ اور بات ہیکہ غلط فیصلہ ہونے پر عدالت انصاف کرتی ہے، بشرطیکہ مسئلہ عدالت کے دائرہ اختیار میں ہو۔

رہنماؤں کے دلوں میں وسوسہ پیدا ہوا کہ نئی نسل اپنی تہذیب سے نابلد ہوتی جارہی ہے۔ نت نیا فیشن، ڈسکو، ٹی وی، ویڈیو اور دوسری ایسی ہی لہروں میں، بہہ کر آج کا نوجوان اپنی تہذیبی لٹیا ڈبونے کے درپے ہے۔ طے پایا کہ تیلگو تہذیب کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے نمائندہ شخصیتوں کے مجسمے نصب کئے جانے چاہیں تاکہ نئی نسل اپنی تاریخ، تہذیب اور فنون لطیفہ سے واقف ہو سکے۔ ابتداء ہی غلط ہوئی۔ تیلگو تہذیب کو ایسے شہر میں اجاگر کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کی تہذیب ملی جلی، مشترکہ، کاسمو پولیٹن اور ایک نمائندہ تہذیب ہے۔ اگر مجسمے نصب کرنے سے تہذیبی شناخت اور ورثہ محفوظ ہو جاتا تو پھر ادیب و شعراء، دانشور و سخنور عقل و فہم کی باتیں کرنے کی بجائے اپنے اپنے مجسمے بنانے میں لگ جاتے اور آنے والی نسلوں کے لئے ہمہ اقسام کے مجسمے چھوڑ جاتے۔ آج ہم غالب اور اقبال کے کلام کو پڑھنے کے بجائے ان کے مجسموں کو دیکھتے رہتے اور ان کا کلام دل نشین ہو جاتا۔ کاش اتنی آسانی سے تہذیبی ورثے کی حفاظت ہو سکتی۔

مجسموں کو نصب کرنے پر چاروں طرف سے اعتراض کیا جارہا ہے۔ مجسموں کی تنصیب کے لئے یہ

مناسب وقت نہیں ہے ۔ شہر میں قحط ہے ۔ پانی کا کال ہے ۔ پچھلے ایک سال سے شہریوں کو دو دن میں ایک مرتبہ چند بوند پانی مہیا کیا جارہا ہے ۔ مہنگائی بڑھ رہی ہے ۔ دماغی بخار سے الگ اموات ہو رہی ہیں ۔ ریاست کے بعض علاقے سیلاب سے بھی دوچار ہیں ۔ کسی نے کہا مجسموں کی قطار کے بجائے نلوں کی قطار لگتی تو اچھا تھا ۔ ایک اور تجویز تھی کہ مجسموں کی تعمیر میں استعمال ہونے والی اینٹ ، سمنٹ ، لوہے اور پتھر سے بھوکوں کا پیٹ بھرا جاسکتا تھا ۔ لیکن جناب ہماری دانست میں مجسموں کی تنصیب کا اس سے بہتر کوئی دوسرا وقت نہیں ہو سکتا تھا ۔ آرٹ اور کلچر ، بھوک پیاس ہی میں کچھ میں آتا ہے اور افلاس کے ساتھ فروغ پاتا ہے آرام میسر آنے کے بعد انسان کو نیند آتی ہے ۔

بعض شہریوں کو اتنے سارے مجسمے ایک مقام پر نصب کرنے پر اعتراض ہے ۔ ایک وقت میں اتنے سارے معززین کو خراج پیش کرنے میں تکلیف ہوتی ہے ۔ سڑک پر سے گزرتے ہوئے سبھی مجسمے ایک جیسے نظر آتے ہیں ۔ سڑک پر مجسموں کو دیکھتے اور ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے گزرنا زندہ راہگیروں کو ان کے قریب پہنچا دیتا ہے ۔ ہر پل خدشہ لگا رہتا ہے کہ شاعر کے مجسمے کے پاس سے گذرتے وقت اس کے کلام میں کھو کر کہیں سامنے سے آتی ہوئی سواری سے گلے نہ مل لیں ۔ مطالبہ ہوا کہ مجسموں کو الگ الگ مقامات پر نصب کیا جائے تاکہ وقت واحد میں ایک ہی فرد کی خدمات کو سراہا جاسکے ۔ ہمارے نزدیک یہ " اعتراض برائے اعتراض " ہے ۔ اتنے سارے مجسموں کی ایک جگہ تنصیب سے ندرت پیدا ہوئی ہے ۔ سڑک کے کنارے قطار میں ڈھیر سارے مجسموں کی تنصیب ہم نے کہیں دیکھی اور نہ ہی سنی ۔ ہمارے شہر کے لئے یہ ایک اعزاز ہے ۔ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں نام آسکتا ہے ۔ اس ریکارڈ کے علاوہ مجسموں کو ایک جگہ نصب کرنے میں ایک نفسیاتی نکتہ پوشیدہ ہے ۔ جیتے جی دانشور کبھی ایک مقام پر اکٹھا نہیں ہوسکتے تھے ۔ نظریاتی اختلافات کی بدولت مختلف اوقات میں تنہا پیدا ہوئے اور تنہا وفات پائی ۔ اگر دانشوروں کو ایک ساتھ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جاسکتا ہے تو وہ یہی ایک طریقہ ہے جسے ہمارے حکام نے روبہ عمل لایا ہے ۔

مزاح نگاروں نے اپنی تخلیقات میں مجسموں کا ذکر کیا ۔ مجتبیٰ حسین کے خیال میں حکومت اس امید پر مجسمے نصب کروا رہی ہیکہ حساس فن کاروں کے مجسموں کی آنکھوں سے عوام کی بے بسی اور مجبوری پر اتنے آنسو بہہ نکلیں گے کہ ریاست میں سیلاب آئے گا اور پانی کی قلت کا مسئلہ حل ہو جائے گا ۔ ہمارے ایک دوست نے اس خیال کو اندھیرے میں امید کی کرن کا عنوان دیا ہے ۔ مسیح انجم نے مجسموں کی تنصیب پر کئے گئے خرچ کا تخمینہ کیا ۔ چار کروڑ سے زائد روپے میں ۳۳ مجسمے نصب ہوئے یعنی فی مجسمہ بارہ لاکھ روپے سے زائد کا خرچ آیا ۔ بارہ لاکھ کی رقم کو دیکھ کر انہوں نے پیش کش کی کہ اگر اتنی رقم انہیں دے دی جائے تو وہ خود مجسمہ بن کر کھڑے ہونے تیار ہیں ۔ صرف آدھے مجسمے کی لاگت میں ہم مجسمہ بن کر کھڑے ہونے تیار ہیں ۔ مجسمہ بننے کا فائدہ ہی ہوتا ہے ۔ مجسمہ بن کر انار کلی نے شہزادہ سلیم کی محبت پائی تھی ۔ فیاض احمد فیضی نے مجسموں کی ایک بنیادی خوبی پر روشنی ڈالی کہ پرندوں کی شرارت پر مجسمے کچھ

نہیں کرتے صرف فضامیں گھورتے رہتے ہیں ۔ اس خوبی کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم تجویز پیش کرتے ہیں کہ مجسموں کے پاس ایک "چڑی مار" کا تقرر کیا جائے جو پرندوں کو مجسموں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے سے باز رکھے ۔

مجسموں کی تنصیب ، ہمارے شہر کے قابل دید مقامات میں ایک اضافہ ہے ۔ فخر سے جہاں ہم چار مینار ، مکہ مسجد ، قلعہ گولکنڈہ ، گورستان قطب شاہی ، عثمان ساگر ، جامعہ عثمانیہ ، سالار جنگ میوزیم ، برلا مندر ، ہائی کورٹ ، دواخانہ عثمانیہ اور زو پارک دکھاتے ہیں ، اب ہم حسین ساگر بھی دکھا کر سیاحوں سے کہیں گے کہ زو پارک میں ہمارے سائنسی آباو اجداد جنہیں ڈارون نے دریافت کیا تھا ، بستے ہیں تو ہمارے تہذیبی آباء و اجداد کے حسین ساگر پر براجمان ہیں ۔ ہماری شناخت اب مکمل ہوئی ہے ۔ جب ہم غم روزگار اور غم زندگی میں کھو کر اپنے آپ کو بھول جائیں گے تو ان دو مقامات کی سیر کر کے خود کو پہچان لیا کریں گے

مجسمے لگ چکے ہیں اور ان کی نقاب کشائی بھی ہو چکی ہے ۔ اعتراض کرنے والے اعتراض کرتے رہ گئے ۔ احتجاج کی دھمکی دینے والے اپنا سامنہ لے کر رہ گئے ۔ اپنی اپنی پسند کے مجسمے نصب کرنے کے مطالبے بھی ہوئے ۔ مزید مجسمے نصب ہونے کے بعد ہو سکتا ہے کہ اس علاقہ کا نام " مجسمہ نگر " یا " مجسموں کا ساگر " رکھنے کی تجویز پیش ہو ۔ ویسے بعض لوگ اپنی دانست میں حسین ساگر کا نام بدل بھی چکے ہیں ۔ خیر!

مجسمے لگنے کے بعد ہمارا گذر حسین ساگر کٹے پر سے ہوا تو دیکھا کہ بانی شہر محمد قلی قطب شاہ کا مجسمہ نہیں ہے ۔ بہت تکلیف ہوئی ۔ ہونی بھی چاہیئے ۔ اگر محمد قلی قطب شاہ شہر حیدرآباد نہ بساتا اور " مرا شہر لوگاں سوں معمور کر " دعا نہ مانگتا تو ہمیں ہر ماہ مضمون لکھنے کا موقع کہاں سے ہاتھ آتا ۔ محمد قلی قطب شاہ کا مجسمہ اس حساب سے بھی نصب ہونا چاہیئے تھا کہ وہ نہ صرف اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا بلکہ تیلگو میں بھی اس نے شعر کہے ۔

معلوم نہیں مجسموں کے انتخاب میں کیا رہنمایانہ اصول بنائے گئے ہیں کہ محمد قلی قطب شاہ کے مجسمے کے ساتھ ہمارے شہر کی تہذیب کے ایک اہم جز اردو کا مجسمہ بھی غائب ہے ۔ " تیلگو تلی " کے ساتھ اردو کا مجسمہ بھی ہونا چاہیئے تھا ضعیف ، نحیف و ناتواں ، قریب المرگ اور جسے اس کے اپنے ہی ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

محمد قلی قطب شاہ اور اردو کے مجسموں کے ساتھ ہم عثمان علی خاں کا مجسمہ بھی نصاب کروانا چاہیں گے ۔ ساتویں اور آخری صاحب اقتدار نظام نے ہمارے شہر کی ترقی کے لئے بہت کچھ کیا ۔ ہم انہیں کی قائم کردہ جامعہ کے فارغ التحصیل ہیں ۔

دسمبر ۔ ۱۹۸۶

بس بس

اگر کوئی قوت برداشت کے مادے کو بڑھانا چاہتا ہے تو اسے شہر حیدرآباد کی بسوں میں سفر کرنا چاہئیے - یہ ہمارا صرف خیال ہی نہیں دعوی بھی ہے، جس نے حیدرآباد کی بسوں میں سفر کیا ہو، اسے جہنم کی تکالیف برداشت کرنے میں دشواری نہیں ہوگی - آئیے دیکھیں آپ ہمارے اس خیال سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں -

بس حاصل کرنے کے لئے بس اسٹانڈ آنا پڑتا ہے - بس اسٹانڈ کا محل وقوع گاہ بہ گاہ تبدیل ہوتا رہتا ہے - کبھی اس پان کے ڈبے کے سامنے تو کبھی اس ہوٹل کے پاس - بس اسٹانڈ بلا علم و اطلاع منتقل ہوجاتا ہے - بس اسٹانڈ کو ڈھونڈنا پڑتا ہے - ہمارے شہر میں حیران اور پریشان لوگ اپنا اثاثہ اٹھائے بس اسٹانڈ کا پتہ پوچھتے نظر آتے ہیں -

خدارا - آپ بس اسٹانڈ کبھی اس امید پر نہ آئیں کہ بس وقت پر مل جائے گی - سفر وسیلہ ظفر اور آرام دہ ہوگا - بس اسٹانڈ پر کمر باندھ کر مصمم ارادے کے ساتھ آنا پڑتا ہے کہ جو بھی مشکلات درپیش ہوں گی - ان کا مقابلہ جوانمردی سے کیا جائے گا - احتیاطی تدابیر اختیار کرنا فائدہ مند ہوتا ہے - سفر کے دوران مضبوط کپڑے ساتھ دیتے ہیں - کہتے ہیں جینس کی ایجاد ہمارے شہر کی بسوں میں سفر کا نتیجہ ہے - بھول کر بھی پیروں میں چپل نہ پہنیں - چپل ٹوٹ جاتی ہے یا کسی کے پاس رہ جاتی ہے - چپل پہننے سے پیر محفوظ بھی نہیں رہتے، کچلے جانے کا اندیشہ رہتا ہے - مضبوط فوجی جوتے کارآمد ہوتے ہیں - پیسے اور دیگر کام کی چیزیں اوپری جیبوں سے نکال کر چور جیبوں میں چھپالینا پڑتا ہے - ہاتھ کی گھڑی اور چشمہ اتار کر محفوظ کرلینا احتیاط کا تقاضہ ہوتا ہے -

بس اسٹانڈ پر مسافر نظام الاوقات دیکھتا ہے جو تضیع اوقات ہے - بسوں کا نظام الاوقات صرف دیکھنے کی چیز ہے، عمل کرنے کے لئے نہیں ہے - بسیں اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہیں - جب چاہیں جیسے چاہیں

اور جدھر چاہیں چلتی ہیں ۔ جہاں جی چاہے رکتی ہیں ۔ گھنٹوں کوئی بس نہیں آتی اور جب آتی ہیں تو ایک کے پیچھے ایک ، تین چار بسیں قطار بنا کر آجاتی ہیں ۔ کبھی تمام دن ایک ہی بس چلتی ہے تو کبھی وہ ایک بس بھی نہیں چلتی ۔ قصہ مختصر ہمارے شہر کی بسوں پر کسی کا بس نہیں چلتا ، ان کے سامنے ہر کوئی بے بس ہے ۔

بس کے لئے انتظار کرنا پڑتا ہے ۔ انتظار کسی کا بھی ہو تکلیف دہ ہوتا ہے ۔ بعض حضرات انتظار کی کوفت سے بچنے کے لئے اخبار بینی اور سیاست پر بحث و مباحثہ شروع کر دیتے ہیں ۔ نوجوان محبت کی پینگیں بڑھاتے ہیں ۔ محبت کی شادیوں میں بس اسٹانڈ پر کی گئی محبت کا تناسب یقیناً زیادہ ہوگا ۔ بس کا انتظار منٹوں سے گھنٹوں ، گھنٹوں سے دن اور دنوں سے ایک عمر کے لئے ہوتا ہے ۔ بقول برق آشیانوی

شب کو بس اسٹانڈ پر ایک نوجوان نے یہ کہا　　صبح دم آیا تھا میں شب کا اندھیرا ہوگیا
ایک مرد پیر نے یہ سن کر فرمایا میاں　　میں جوانی میں یہاں آیا تھا بوڑھا ہوگیا

بس اسٹانڈ پر ہدایت لکھی ہوتی ہے کہ بس کا انتظار قطار بنا کر کیجئے ۔ " کیو " بنانے کا طریقہ نازیوں کی پیداوار ہے ۔ شاید اسی لئے ہمارے جمہوری شہر میں کیو کا رواج نہیں ہے ۔ ہر مسافر اپنے آپ کو بس میں پہلے سوار ہونے کا حقدار سمجھتا ہے اور ہر مسافر کی اپنی ایک الگ لائن ہوتی ہے ۔ چند مسافرین ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے ہو کر قطار بناتے ہیں جو بس کے آتے ہی بکھر جاتی ہے ۔ جدھر سے بس آتی ہے تمام مسافرین کی نظریں ادھر ہی اٹھی رہتی ہیں ۔ دور سے بس دکھائی دینے والی شئے قریب آکر کبھی لاری تو کبھی آٹو رکشہ بن جاتی ہے ۔ ماضی میں بسوں کا مخصوص رنگ ہوا کرتا تھا جس سے شناخت آسان تھی ۔ آج شہر میں بسیں مختلف رنگوں سے مزین ، تجارتی اشیاء کا اشتہار بنی پھرتی ہیں ۔ اشتہار ایک علامتی پہچان بھی ہیں ۔ ہمارا لڑکا " چاکلیٹ بس " میں اسکول جاتا ہے ۔ ہم دردسر کی دوا کے اشتہار والی بس میں دفتر جاتے ہیں ۔

بس کو پہچاننے کے بعد دوسرا تکلیف دہ مرحلہ روٹ نمبر تلاش کرنا ہوتا ہے ۔ روٹ نمبر اور منزل کا نام کلاسکی اور جدید آرٹ کے امتزاج اور ہمہ اقسام کے رنگوں سے اس طرح لکھا جاتا ہے کہ پڑھے لکھے اور قابل مسافروں کو بھی ان پڑھ حضرات کی طرح بس میں سوار اشخاص سے استفسار کرنا پڑتا ہے " بس کہاں جائے گی ۔ " مختلف نام بتلائے جاتے ہیں ۔ اسی دوران بس نامعلوم مقام کے لئے روانہ ہو جاتی ہے ۔ بس کے منتظرین میں رائے زنی ہونے لگتی ہے ۔ " میرے خیال میں یہ نوتیس کی بس تھی ۔ " " بس پر روٹ نمبر اور جگہ کا نام نمایاں طور پر ہونا چاہیئے ۔ " " روٹ نمبر اور مقام کا نام اردو میں بھی لکھنا چاہیئے ۔ " ہمارے شہر کی بسوں اور اردو زبان میں ازلی دشمنی چلی آرہی ہے ۔ کسی بھی بس پر کہیں بھی اردو لکھی نہیں جاتی ۔

بس اسٹیج پر نہیں ٹھہرتی ۔ آگے یا پیچھے رکتی ہے ۔ مسافرین بس میں سوار ہونے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں ۔ جیسے ہی مسافرین بس کے قریب پہنچتے ہیں ، بس ان سے دور جانے کے لئے چل پڑتی ہے ۔ بعض اوقات بھاگ دوڑ میں مسافر کی منزل مقصود آجاتی ہے ۔ ٹکٹ کے پیسے بچنے کے ساتھ ورزش بھی ہو جاتی ہے ۔

بس رکتی ہے تو مسافرین دروازہ پر یلغار کر دیتے ہیں ۔ بس کے دروازے میں سے صرف ایک

آدمی آیا جاسکتا ہے لیکن وقت واحد میں کئی آدمی آتے اور جاتے ہیں ۔ بعض مرتبہ دروازے کے قریب پہنچتے ہیں کہ بس چل پڑتی ہے ۔ بس تو خیر چلی جاتی ہے لیکن دیگر مسافرین کے درمیان سے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے ۔ گردن کو کسی کی بغل سے کھینچنا پڑتا ہے ۔ ایک ہاتھ کو چار لوگوں کے چنگل سے آزاد کرانا پڑتا ہے ۔ دوسرا ہاتھ جو کسی کے بستے میں الجھا رہتا ہے ، صاحب بستہ کی گالیاں سنتے ہوئے بستے میں سے نکالنا پڑتا ہے ۔ مشقت کے بعد جب اپنے آپ کو اکٹھا کر لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ منی پرس غائب ہے ۔ چشمہ ٹوٹ چکا ہے ۔ شرٹ پھٹ گیا اور پتلون اتر چکی ہے ۔ اس صدمہ جانکاہ سے مالک حقیقی کی طرف لوٹنے کے بجائے بے غیرتی کے ساتھ پھر سے اپنے ہوش و حواس یکجا کر کے دوسری بس کا انتظار کیا جاتا ہے ۔

ہمارے شہر کی بسیں مسافرین سے کھچا کھچ بھری ہوتی ہیں ۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی ۔ شاذ و نادر ہی کوئی خالی بس صحرا میں نخلستان کی طرح نظر آتی ہے ۔ شہر حیدرآباد کے مسافرین کی خوبی ہے کہ وہ دروازوں میں لٹک کر سفر کرنا پسند کرتے ہیں ۔ بس خالی بھی ہو تو فٹ بورڈ پر کئی مسافر لٹکتے نظر آئینگے ۔ دروازہ کے پاس لوگ ڈنڈوں کو پکڑے لٹکتے رہتے ہیں ۔ چند لوگ انھیں پکڑ کر جھولتے رہتے ہیں ۔ ایک دو حضرات لٹکنے والوں میں اٹکے ہوتے ہیں یا لٹکتے ہوئے مسافرین پر باقاعدہ سوار ہوتے ہیں ۔ ہم نے مسافرین کو بس کی چھت پر بیٹھے سفر کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے ۔ دروازوں پر ہجوم کے باعث مسافر کھڑکیوں اور چھت کی راہ سے بھی بس میں وارد ہوتے ہیں ۔ دروازہ سے بس میں داخل ہونے کے لیے کرتب بازی کرنی پڑتی ہے ۔ کسی کی بغل تو کسی کی ٹانگوں میں سے تڑپ کر نکلتے ہوئے کسی اور کے ہاتھوں پر سے پھسلنا پڑتا ہے ۔ اس طرح کہنے کو ہم بس میں سوار تو ہو جاتے ہیں لیکن حقیقتاً ہم دروازے کے قریب مسافرین میں اٹکے ہوئے ہوتے ہیں ۔ مشکل سے ایک پیر کو آگے بڑھا کر دوسروں کے پیروں پر رکھتے ہیں اور اچھل کر بس کے اندر لگے ڈنڈے کو پکڑتے ہیں ۔ دوسرے پیر کو قریب کرنا چاہتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس پیر کے ہم ہی حقدار نہیں ہیں ۔ ہمارے علاوہ اور بھی مسافر اس پیر کے دعویدار ہیں ۔ اس اثناء میں بس کو ایک زوردار جھٹکا لگتا ہے ۔ جھٹکے کے طفیل چہرے پر جلتے ہوئے سگریٹ کا نشان لگ جاتا ہے ۔ نظریں اٹھا کر دیکھتے ہیں تو ایک ہاتھ میں جلتا سگریٹ نظر آتا ہے لیکن ہاتھ کے مالک کا پتہ نہیں چلتا ۔ آہستہ آہستہ غصہ فرو ہونے لگتا ہے پسینہ پونچھنے اور سانسیں درست کرنے کے درمیان محسوس ہوتا ہے کہ پیروں کے پاس کوئی حرکت کر رہا ہے ۔ حیران اور پریشان جھک کر دیکھتے ہیں ۔ ایک چھوکرا لڑکا کاندھے پر کتابوں کا بوجھ لادے ہماری ٹانگوں کے درمیان سے طلوع ہو رہا ہے ۔

بس میں سوار ہونے کے بعد تکالیف کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا بلکہ ان میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے ۔ شہر حیدرآباد کی بسوں میں بیٹھنے کے لئے سیٹ نہیں ملتی ۔ اس کا احساس انہیں بھی ہے جو بسیں چلاتے ہیں ۔ اس لئے ہمارے شہر میں "اسٹانڈنگ بسیں" چلائی جاتی ہیں ۔ بس میں مسافرین بیٹھتے نہیں بلکہ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے سفر کرتے ہیں ۔ برائے نمونہ چند سیٹیں موجود رہتی ہیں ۔ قسمت سے بیٹھنے کا موقع مل جائے تو ایک پہلو پر بیٹھنا پڑتا ہے ۔ سیٹ سے ٹیک لگائے ایک اور مسافر کھڑا ہوتا ہے ۔ یوں بھی بس کی

سیٹ پر زیادہ وقت بیٹھنے سے چند بیماریاں لاحق ہوتی ہیں ۔ ایسا ہی ایک مرض لئے ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچے ۔ ڈاکٹر نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا" لوگوں کے ساتھ آپ کے غلط تعلقات معلوم ہوتے ہیں ۔" ہم نے کان پکڑ کر انہیں یقین دلایا کہ یہ مرض شہر کی بسوں میں سفر کرنے کا نتیجہ ہے ۔ بس میں خالی شدہ سیٹ کے لئے " میوزیکل چیر" جیسا مقابلہ ہوتا ہے ۔ لوگ اس مسافر کی تلاش میں رہتے ہیں جو بار بار کھڑکی سے باہر دیکھتا اور اٹھنے کے لئے بے چین ہے ۔ ادھر ادھر سے چار چھ مسافر سیٹ کے قریب پہنچ جاتے ہیں ۔ مسافر اپنی منزل آنے پر سیٹ سے اٹھ جاتا ہے ۔ جیسے ہی وہ اٹھتا ہے دور کھڑے مسافر دستی یا اخبار سیٹ پر پھینک کر قبضہ جمانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کامیاب ہو نہیں پاتے ۔ تین چار مسافر بیٹھنے کے لئے جھپٹ پڑتے ہیں لیکن خدائی فوجدار بن کر کوئی اور ہی مسافر کہیں سے سیٹ پر ٹپک جاتا ہے ۔ اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے نوجوان اپنی سیٹ سے اٹھنے کا انداز اپناتے ہیں ۔ چند مسافر دوڑ پڑتے ہیں لیکن پھر وہی نوجوان " ابھی منزل دور ہے" کہہ کر سیٹ پر بیٹھ جاتا ہے ۔

ہمارے شہر کی اکثر بسیں پرانی اور خستہ حال ہیں ۔ کھڑکیوں میں آئینے اور نہ ہی پردے لگے ہیں ۔ بارش ، دھوپ ، دھول ، سامان اور مسافرین کی سہولت بخش آمد و رفت جاری رہتی ہے ۔ سیٹ ٹوٹی پھوٹی جس میں کھٹمل بسیرا کرتے ہیں ۔ جگہ جگہ کیلے اور نوکیلے مین کے ٹکڑے مسافروں کو زخمی کرنے کے لئے لگے ہوتے ہیں ۔ جب بس چلتی ہے تو ہر پرزہ لرزہ بر اندام رہتا ہے ۔ ایک مخصوص آواز پیدا ہوتی ہے ۔ مسافرین کے جسم میں برقی رو کی طرح بس کی آواز کی لہریں گزرنے لگتی ہیں ۔ ہمارے شہر کی بسوں میں سفر کرنے سے جسم میں سفری ارتعاش پیدا ہوتا ہے ۔ بس چلتی کم اور جھٹکے زیادہ لگاتی ہے ۔ بیل گاڑی کے سفر میں بھی اتنے جھٹکے نہیں لگتے جتنے ہمارے شہر کی بسوں میں لگتے ہیں ۔ مسافر کے انجر پنجر ڈھیلے ہو جاتے ہیں ۔ کبھی ادھر گر رہے ہیں تو کبھی ادھر لڑھک رہے ہیں ۔ کبھی سر تو کبھی گھٹنے کو مار لگ رہا ہے ۔ معمولی حادثات سے نمٹنے کے لئے بسوں میں فرسٹ ایڈ باکس رکھنے کا لزوم ہے ۔ ہمارے ایک دوست نے اپنے لڑکے سے دریافت کیا" فرسٹ ایڈ کسے کہتے ہیں ۔" جواب ملا" شہر کی بسوں میں ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے موجود خالی ڈبہ فرسٹ ایڈ کہلاتا ہے" ۔

خواتین کے تعلق سے ہر کوئی نرم گوشہ رکھتا ہے ۔ ہمارے شہر کی بسوں میں خواتین کے لیے پچیس فیصد گوشہ مقرر تھا جسے بڑھا کر چالیس فیصد کر دیا گیا ہے ۔ جب ہمدردی بڑھ جاتی ہے تو بس " مخصوص برائے خواتین" بن جاتی ہے ۔ یہ ہمارے شہر کے بسوں کی نسوانی خوبی ہے ۔

بس دو اشخاص کے قابو میں ہوتی ہے ۔ ایک ڈرائیور جو بس چلاتا ہے اور دوسرا کنڈکٹر جو مسافروں کو چلاتا ہے ۔ ڈرائیور ہمیشہ سگریٹ پیتا رہتا ہے ۔ بس میں جلی حرفوں میں " تمباکو نوشی منع ہے " لکھا ہوتا ہے لیکن تمباکو نوشی ڈرائیور سے شروع ہوتی ہے ۔ کنڈکٹر پان ، چھالیہ یا چیونگم سے شغل کرتا ہے ۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر مل کر وقفے وقفے سے چائے پیتے ہیں ۔ مسافرین کو ڈرائیور سے زیادہ کنڈکٹر سے واسطہ پڑتا ہے ۔ کنڈکٹر کم سے کم وقت میں ٹکٹ کے پیسے نکالنے کے لیے کہتا ہے ۔ سفر کے دوران پیسے نکالنے کے لئے سرکس

کرنی پڑتی ہے ۔ اس پر گرتے ، اس پر پڑتے اور کچھ ریزگاری نیچے گرا کر ٹکٹ کے لئے پیسے دیتے ہیں ۔ کسی کنڈکٹر کے پاس چلر نہیں رہتا ۔ کنڈکٹر صاحب ٹکٹ کے پیچھے بقیہ رقم لکھ کر دستخط کر دیتے ہیں کہ اترتے وقت اس چیک کو بھنالیں لیکن صاحب اپنے آپ کو یکمشت اتار لینا ایک مسئلہ ہے ، مسافر کو پیسے واپس لینے کا ہوش کہاں رہتا ہے ۔ ڈرائیور کی کرتب بازی اور کنڈکٹر کی سستی وقت سے پہلے ٹکٹ دینے میں حائل رہتی ہے ۔ ہمارے شہر میں جا بجا بسیں ، مسافرین ، کو ٹکٹ دینے کے لئے رکی رہتی ہیں ۔

ہمارے شہر کی بسوں میں سفر کرنا جرمانے کے ساتھ قید بامشقت ہے ۔ جرمانے سے ہماری مراد ٹکٹ سے ہے ۔ سیٹ ملے یا نہ ملے ، بھلے ہی آپ ایک ٹانگ پر کھڑے سفر کر رہے ہوں ، ٹکٹ بہر حال خریدنا پڑتا ہے ۔ کبھی کبھار کچھ پیسے کنڈکٹر کے ہاتھ میں رکھ کر کم پیسوں میں سفر کر سکتے ہیں ۔

ہمارے شہر میں کئی قسم کی بسیں چلتی ہیں ۔ آرڈنری ، پاسنجر ، لوکل ، اکسپریس ، سوپر اکسپریس ، ڈیلکس ، سوپر ڈیلکس ، لکژری ، سوپر لکژری ، سیمی لکژری ، ایشیاڈ وغیرہ وغیرہ ۔ تمام بسوں میں ایک ہی قسم کی سہولت اور تکلیف حاصل ہوتی ہے ۔ فرق کرائے اور بس کے رنگ کا ہوتا ہے ۔ ہر قسم کی بس کی رفتار بھی ایک ہوتی ہے ۔ آہستہ چلتی ہیں ۔ سامان سے لدی پھندی لاریاں بس کو پیچھے چھوڑتی چلی جاتی ہیں ۔ بعض مرتبہ سیکل سوار بھی ہاتھ ہلاتے آگے نکل جاتے ہیں ۔ ڈرائیور عذر پیش کرتے ہیں کہ بسوں کی رفتار کو مقفل کر دیا گیا ہے ۔ بعض وقت مقفل رفتار سے مضحکہ خیز صورت پیش آتی ہے ۔ چند بسیں تمام مسافرین کو ساتھ لئے چڑھاؤ چڑھ نہیں سکتیں ۔ کچھ مسافر اتر جاتے اور پیدل چلتے ہیں ۔ اتار آنے پر پھر سب بس میں سوار ہو جاتے ہیں ۔

بس میں سوار ہونے کے لیے جو مشکل ہوتی ہے اتنی ہی پریشانی بس سے اترنے میں پیش آتی ہے ۔ منزل آنے سے پہلے اپنے آپ کو دروازے کے پاس پہنچنا ہوتا ہے ۔ ہجوم کی وجہ سے دروازے کا پتہ نہیں چلتا ایک مرتبہ دروازے کی تلاش میں ہم لوگوں کے ہاتھوں اور پیروں سے ہوتے ہوئے ایک مسافر کی گود میں جا پڑے تھے ۔ اسٹیج پر بس روکنے اور نہ روکنے کا مطالبہ ہوتا ہے ۔ جنہیں اترنا نہیں ہوتا کہتے ہیں " لوگ زیادہ ہیں یہاں بس نہ روکو ، اور لوگ آجائیں گے تو کیا ہمارے سر پر سوار ہوں گے ۔ " جنہیں اترنا ہوتا ہے بس ٹھہرانے کے لئے چیختے ، چلاتے ، گھنٹی بجاتے اور چھت پیٹتے ہیں ۔ بس کبھی مقررہ مقام پر نہیں رکتی ۔ ہمیشہ ایک نئی جگہ ٹھہرتی ہے ۔ صحیح معنوں میں بس رکتی نہیں رینگتی رہتی ہے ۔ جیسے ہی ہم اترنے کے لئے دروازے کے پاس پہنچتے ہیں دوسرے مسافر ہمیں اٹھا کر سڑک پر پھینک دیتے ہیں ۔ سڑک کی خاک چوم کر محسوس ہوتا ہے کہ نرگ میں کرموں کو بھوگ کر ہمارا پھر سے جنم ہوا ہے ۔

اپریل ۔ ۱۹۸۲ء

آٹو رکشہ کرائے پر

آٹو رکشہ عجیب و غریب سواری ہے ۔ مثلث شکل کی سواری کسی طرف سے سمجھ میں نہیں آتی ۔ کہیں سے بھی سمجھنے کی کوشش کسی ایک کونے میں پہنچ کر الجھن بن جاتی ہے ۔ باوجود کوشش آٹو رکشہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا ۔ آٹو رکشہ ڈرائیور بھی ہماری اور شاید خود ان کی اپنی سمجھ سے باہر ہے ۔ سواری کی طرح ڈرائیور کی بھی اپنی منفرد قسم ہے بلکہ ہم انہیں ایک مختلف مخلوق کہنا پسند کریں گے ۔ ہر آٹو رکشہ ڈرائیور ایک سانچے میں ڈھلتا ہے ۔ ان میں فرق کرنا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے ۔ وہ کسی کا حکم مانتے ہیں اور نہ کسی کی التجا سنتے ہیں ۔ وہی کرتے ہیں جو ان کے مزاج میں آتا ہے ۔

آٹو رکشہ کرائے پر حاصل کرنا مرحلہ وار معرکہ ہے ۔ یہ تین مرحلوں میں سرانجام پاتا ہے ۔ پہلا مرحلہ خالی آٹو رکشہ کی تلاش ہے ۔ دوسرے مرحلے میں آٹو رکشہ ڈرائیور کو مطلوبہ جگہ چلنے کے لئے راضی کرنا ہے ۔ تیسرا اور آخری مرحلہ کرائے کا بھاؤ تاؤ کرنا ۔

چلتے ہوئے یار کے ہوئے ، سواری کے ساتھ یا خالی آٹو رکشہ شہر میں ہر جگہ موجود رہتے ہیں ۔ اسٹانڈ پر بھی کئی آٹو رکشہ ٹھہرے ہوتے ہیں لیکن بہ کرایہ پر نہیں چلتے وہ وہاں آرام کرنے ، ایک دوسرے سے ملنے یا یونین کے کام کے لئے ٹھہرے رہتے ہیں ۔ خالی آٹو رکشہ کی تلاش ایک دلچسپ مرحلہ ہوتا ہے ۔ آنکھیں پیلے تکون کو تلاش کرتی ہیں ۔ کان مخصوص آواز سننے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں ۔ ناک پٹرول اور مٹی کے تیل کی ملی جلی بو سونگھنے کی کوشش کرتی ہے ۔ ہاتھ ، پیر آٹو رکشہ کی طرف لپکنے کے لئے بے چین رہتے ہیں ۔ آٹو رکشہ نظر آتے ہی باچھیں کھل جاتی ہیں ، لگتا ہے دونوں جہاں کی نعمت مل گئی ۔ آٹو رکشہ گاہک کی طرف آتا ہے اور گاہک آٹو رکشہ کی طرف بڑھتے ہوئے " آٹو ۔۔۔۔ آٹو ۔۔۔ " کی ہانک لگاتا ہے ۔ جواب میں کبھی ڈرائیور کی آواز آتی ہے " بازو ہٹو ۔ " اکثر ہارن بجتا ہے " ہاتو ۔۔۔ ہاتو ۔۔۔ " آٹو رکشہ میں مخصوص ہارن لگے ہوتے ہیں ۔ آٹو رکشہ گاہک کی نظروں میں دھواں اور دھول جھونکتے ہوئے دور چلا جاتا ہے ۔ بعض وقت

ڈرائیور مسافر کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلتے ہیں۔ "آٹو۔۔۔آٹو۔۔۔" کی آواز سن کر آٹو رکشہ کچھ دور لے جاکر روکتے یا آہستہ کرتے ہیں۔ گاہک آٹو رکشہ کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے اور جب قریب پہنچتا ہے تو وہ دھواں چھوڑتا ہوا آگے چلا جاتا ہے۔ گاہک کھانستے، کپڑے جھٹکتے اور دل ہی دل میں کوستے دوسرے آٹو رکشہ کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ بعض مرتبہ آٹو رکشہ حاصل کرنے کا دلچسپ مرحلہ خطرناک صورت اختیار کر جاتا ہے۔ ادھر ادھر بھاگ دوڑ میں حادثہ ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ بیگم کو میٹرنٹی ہاسپٹل لے جانے کے لئے ہم نے آٹو رکشہ کی تلاش شروع کی۔ لمحوں سے منٹ بنے اور منٹوں سے گھنٹے۔ قریب تھا کہ دن بھی ختم ہو جاتا، پڑوسی نے آکر ڈھارس بندھائی "آٹو رکشہ نہیں ملا۔ کوئی بات نہیں۔ گھر چلیئے۔ آپ کو لڑکا ہوا ہے۔ اب اسے ہی آٹو رکشہ لانے کے لئے بھیجیں گے۔"

کافی وقت گنوانے اور بہت ساری قوت ضائع کرنے کے بعد آٹو رکشہ دستیاب ہوتا ہے۔ ہونا تو یوں چاہیئے کہ مسافر آٹو رکشہ میں بیٹھ جائیں اور ڈرائیور میٹر ڈال کر آٹو رکشہ اسٹارٹ کردے اور پوچھے "صاحب کہاں لے چلوں۔" اس طرح صرف خیالوں میں ہوتا ہے۔ گاہک اور آٹو رکشہ ڈرائیور میں بات ہوتی ہے اور ہر اہم مذاکرہ کی طرح بات آگے نہیں بڑھتی۔ آٹو رکشہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ بے چارہ گاہک پھر سے تلاش میں لگ جاتا ہے۔ جہاں مسافر جانا چاہتا ہے وہاں آٹو رکشہ چلنا نہیں چاہتا۔ ڈرائیور صاف انکار کر دیتا ہے۔ "ادھر نہیں چلنا ہے"۔ بعض ڈرائیور ناراضگی کا خیال کرتے ہوئے بہانے بناتے ہیں۔ "ٹریفک زیادہ ہوتی ہے" "واپسی میں سواری نہیں ملتی۔" "آج ادھر آٹو رکشہ اور ڈرائیور کو پولس پکڑ رہی ہے" "گاڑی بند کرنا ہے۔" مسافر کی ذرا سی غیر ذمہ دارانہ بات سے ڈرائیور ناراض ہو کر ہوا ہو جاتے ہیں یا پھر آٹو رکشاؤں کی ہڑتال کا اندیشہ رہتا ہے۔ ہم نہایت ادب سے بات کرتے ہیں۔ نظریں نیچی کئے ہاتھ باندھے گذارش کرتے ہیں "بھائی صاحب مجھے فلاں جگہ چلنا ہے۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو اور آپ راضی و خوش ہیں تو کیا میں آپ کے آٹو رکشہ میں بیٹھ جاؤں"؟

مسافر کی مطلوبہ منزل کو چلنے کے لئے آٹو رکشہ ڈرائیور کی رضامندی مشروط ہوتی ہے۔ "تین سے زائد سواریاں نہیں بٹھاؤں گا" چاہے چوتھی سواری دودھ پیتا بچہ ہی کیوں نہ ہو۔ "راستے میں کہیں نہیں ٹھہروں گا"۔ "آٹو رکشہ خراب ہونے پر دھکا دینا ہوگا" "راستے میں کہیں بھی سواریوں کو چھوڑ کر جانے کی آزادی حاصل رہے گی۔" مسافر ڈرائیور کے رحم و کرم کے محتاج ہو کر سفر کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ آٹو رکشہ ڈرائیور نے ہماری بتلائی ہوئی جگہ چلنے کے لئے شرط رکھی "صاحب آٹو رکشہ میں معمولی خرابی ہے۔ اسے درست کروا لیجئے گا پھر میں آپ کو لے چلتا ہوں۔" ضرورت بڑی بری چیز ہوتی ہے۔ ہم نے آٹو رکشہ ڈرائیور کی شرط مان لی اور ہمیں کرائے کی رقم سے کئی گنا زائد رقم درستگی کے لئے ادا کرنی پڑی تھی۔

آٹو رکشہ ملنے اور مطلوبہ جگہ چلنے کے لئے تیار ہونے کے بعد کرائے کا بھاؤ تاؤ کرنا تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے۔ پولس اور ٹرانسپورٹ محکموں کو بتانے اور عوام کو دھوکہ دینے کے لئے آٹو رکشہ میں میٹر نصب ہوتا ہے۔ شاید ہی کوئی آٹو رکشہ میٹر سے چلتا ہے۔ ہم نے ایک ڈرائیور سے دریافت کیا "کیا آپ کا آٹو رکشہ

میٹر سے چلے گا" جواب دیا گیا" صاحب آٹو رکشہ پٹرول سے چلتا ہے۔ڈرائیور اسے پیسوں کے لئے چلاتا ہے۔ میٹر کا کوئی کام نہیں ہوتا۔اسے مجبوراً بلکہ قانوناً نصب کیا جاتا ہے۔"اکثر ڈرائیور قانون کو بہلانے کے لئے میٹر چلاتے ہیں لیکن گاہک سے من چاہا کرایہ وصول کرتے ہیں۔چند ڈرائیور بامروت ہوتے ہیں۔قانون کا لحاظ کرتے ہوئے آٹو رکشہ میٹر سے چلاتے ہیں لیکن آٹو رکشہ ڈرائیور ہونے کے ناطے میٹر سے دو، تین یا چار روپیہ زیادہ وصول کرتے ہیں۔میٹر سے زائد اور من مانی کرایہ وصول کرنے کے لئے ڈرائیور کئی عذر لنگ پیش کرتے ہیں۔"رات ہو گئی ہے" "دھوپ تیز ہے"۔"بچے زیادہ ہیں" "واپسی میں سواری نہیں ملتی۔" "سامان ساتھ ہے" "اپنے موڈ کے خلاف آٹو رکشہ چلا رہا ہوں" وغیرہ۔وغیرہ۔

حکومت نے عوام پر آٹو رکشہ کے ظلم کو قابو میں رکھنے کے لیے شکایت کرنے کی ہدایت دی ہے۔ طریقہ شکایت آسان ہے۔پوسٹ کارڈ چھپوا کر جگہ جگہ رکھ دیئے گئے ہیں۔گاہک کو صرف آٹو رکشہ کا نمبر درج کرنا ہوتا۔شاید ہی کوئی گاہک شکایت کرتا ہے۔اندیشہ رہتا ہے کہ شکایت پر حکومت کی کارروائی کے خلاف آٹو رکشہ ہڑتال نہ کردیں۔ویسے اگر کوئی شکایت کرنے کی ٹھان ہی لے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ ایک دانہ ہی نہیں پورا انار کھٹا ہے۔ایک مرتبہ ہم شکایت کرنے کی نیت سے آٹو رکشاؤں کے نمبر نوٹ کرتے گئے۔ایک گھنٹہ میں کاغذ پر اتنے نمبرات درج ہو چکے تھے کہ اس پر ہمیں میٹرک کے سپلیمنٹری نتیجہ کا گمان ہونے لگا۔ڈھیر سارے نمبرات دیکھ کر شکایت کرنے کے لئے ہمیں خود شرم آنے لگی اور ہم نے کاغذ کے پرزے پرزے کر دیے۔

آٹو رکشہ کرائے پر حاصل کرنے کے ارادے سے جو پریشانیاں اور مصیبتیں شروع ہوتی ہیں وہ سفر ختم ہونے تک موجود رہتی ہیں۔کرایہ کی رقم ادا کر کے ان سے چھٹکارا ملتا ہے۔ڈرائیور کی کوشش رہتی ہے کہ وہ مطلوبہ رقم سے زائد اینٹھ لے۔ کسی ڈرائیور کے پاس کبھی چلر نہیں رہتا اور ہر سواری اس کی پہلی سواری ہوتی ہے۔کرائے سے زائد رقم دینے پر ڈرائیور مسکرا کر قبول کرتا ہے۔جو کچھ پیسے ڈرائیور واپس کر دے، اس کی مہربانی ہوگی۔اگر مسافر بقیہ رقم کا مطالبہ کرے تو ڈرائیور اسے گھور کر دیکھتا ہے جیسے اس نے گالی دی ہو۔ایک مرتبہ ہم نے تیس پیسوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔ڈرائیور نے ڈانٹ پلائی "آپ پیدل کیوں نہیں چلے آئے۔آٹو رکشہ میں بیٹھے ہیں تو پیدل آدمی کی سی حرکتیں نہ کیجئے۔"

مختصراً حیدرآبادیوں کے لئے آٹو رکشہ کرائے پر حاصل کرنا اور اس میں سفر کرنا دشوار کن اور وبال جان معرکہ بن گیا ہے اور یہ معرکہ مجبوراً صنف نازک کے لئے انجام دینا پڑتا ہے۔اکثر بیوی اپنے شوہر کو طعنہ دیتی ہے "جائیے آپ کیا خاک ہم سے محبت کرتے ہیں۔بازار جانے کے لئے کرائے پر ڈھنگ کا آٹو رکشہ نہیں لا سکتے!"

ستمبر۔۱۹۸۳ء

الوداع ستمبر

حیدرآباد ساحلی شہر نہیں ہے کہ طوفان باد و باراں سے متاثر ہوتا۔ سرحدی شہر نہیں ہے کہ جنگ کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ نیچے آتش فشاں کنویں بھی نہیں ہیں کہ بار بار زلزلے آتے۔ آب و ہوا معتدل، نہ گرمی کی شدت سے نڈھال اور نہ ہی برف باری سے انتقال، لیکن انسانی فطرت کو قرار کہاں، مصائب اور آلام انسانی جبلت میں ہیں۔ سال کے تین سو پینسٹھ دن ایک جیسے نہیں رہتے، کچھ دن تباہی و بربادی کے لئے مختص ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے سال کا نواں مہینہ وبال جان ہوتا ہے۔ تقریباً ہر سال ستمبر میں شہریوں پر اتنے ستم ہوئے کہ اب حیدرآبادی ستمبر کو "ستمگر" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ستمبر شروع ہوتے ہی مشکلات برداشت کرنے کے لئے کمربستہ ہوجاتے ہیں اور مہینہ ختم ہونے کے بعد سکون کا سانس لیتے ہیں۔

ہمارے شہر میں بارش کو ماہ ستمبر سے عشق ہے۔ دوسرے مہینوں میں بارش ہو یا نہ ہو ستمبر میں بارش کی امید رہتی ہے۔ بارش ہوتی بھی ہے اور ایسی کہ ندی نالے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ریل گاڑیاں بہہ جاتی ہیں اور جب کبھی اس مہینے میں بارش نہ ہو تو سمجھئے خشک سالی ہے۔ ہمارے ایک دوست کہتے ہیں "بھئی عجیب مہینہ ہے۔ بارش ہو تو ستم اور اگر نہ ہو تو مزید ستم"۔ ۱۹۰۸ء میں ستمبر کے مہینے میں موسی ندی میں طغیانی آئی تھی۔ شہر پانی میں ڈوب گیا تھا۔ اس طغیانی کی روداد بیان کرنے والے اب چند گنے چنے حضرات رہ گئے ہیں۔ آج کی نسل کے لئے یہ سانحہ ایک کہانی ہے۔

۱۹۰۸ء کی طغیانی ایک قدرتی عذاب تھا جو ہم حیدرآبادیوں پر نازل ہوا۔ اس طغیانی کی ایسی دھاک بیٹھی ہے کہ ہر ستمبر میں ہم پر طوفان کا خوف طاری ہوجاتا ہے۔ اسی خوف کی وجہ سے ہم ستمبر ۱۹۷۰ء میں ایک نقلی طغیانی لے آئے۔ سرشام ایک زبردست افواہ نے عثمان ساگر کو توڑا اور پانی کو شہر میں بہا دیا۔ "پانی آیا ـ ـ ـ ـ پانی آیا ـ ـ ـ ـ" کا واویلا مچا۔ ہر کوئی افراتفری کے عالم میں اونچی اور محفوظ جگہ کی تلاش میں دوڑنے لگا۔ اس دن سے آج تک ہم خوف و دہشت سے دوڑے چلے جارہے ہیں۔ کبھی جلوس کے ڈر

سے تو کبھی کرفیو کی وجہ سے!

اصلی اور نقلی طغیانی کی تباہیوں کا اثر آج بھی ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہے۔ ہلکی پھوار سے ہی دل ڈوبنے لگتا ہے۔ سڑک پر جمع ہوئے پانی میں قدم رکھتے ہیں تو آنکھوں کے سامنے "پانی آیا ---۔ پانی آیا --۔ گندی پیٹ کا پانی آیا۔" والا منظر گھومنے لگتا ہے۔ ہونا تو یوں چاہیئے تھا کہ ہم حیدرآبادی ہر سال خود ساختہ طغیانی کا دن "ستمبر ڈے" یا پھر "واٹر ڈے" کے عنوان سے افواہوں کو فروغ دینے کے لیے مناتے اور ستمبر کے ساتھ چسپاں "ستمگر" کے لیبل سے جان چھڑاتے۔

پچھلے چند برسوں سے ہم نے ستمبر کے مہینے میں نت نئے جلوس نکالنے شروع کئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب جلوس نکلے گا تو اس پر پتھراؤ ہوگا اور پھر فساد پھیلے گا۔ کرفیو نافذ ہوگا۔ چھرا زنی کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگا۔ اس سال ۱۹۸۴ء کے ستمبر میں یہی سب کچھ ہوا۔ ہم نے نویں مہینے کی نویں تاریخ کو فساد بپا کر ڈالا۔ سنتے ہیں حالات کو بگاڑنے کے لئے دوسرے مقامات سے لوگ آئے تھے۔ مہینہ بھر قتل و خون کا بازار گرم رہا۔ جو حیدرآبادی فسادات سے محفوظ رہے کرفیو میں قید ہوگئے۔ انہیں لگا کہ اس سال ستمبر کا مہینہ آیا ہی نہیں۔ دو دن قبل ہمارے ایک دوست نے کہا "یہ سال گیارہ مہینوں کا ہے۔" جو لوگ فساد سے متاثر ہوئے ان کے لئے اس مہینے گویا قیامت آئی۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ ہم نے پڑھا تھا کہ جب روم جل رہا تھا تب نیرو دور پہاڑ پر بیٹھا گتار بجا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آگ کے شعلوں اور لوگوں کی آہ و بکا سے اس کے ساز میں سوز و گداز پیدا ہوگا۔ کچھ اس طرح کے واقعہ کو ہمارے شہر میں تاریخ نے ستمبر کے مہینے میں دہرایا ہے۔ ستمبر کے مہینے کو ستمگر بنانے کی روایت کو تقویت پہنچی۔ قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی محبت سے پرنور شہر میں آگ لگی تھی، کشت و خون کا کاروبار جاری تھا۔ کئی نیرو اقتدار کی رسہ کشی میں مصروف تھے۔ ان نیروں کا خیال تھا کہ اس طرح سے جمہوریت بحال ہوگی۔ اقتدار کی رسہ کشی کا تماشہ دیکھنے اور جمہوریت بحال کرنے کے لئے مختلف مقامات کے کئی لوگ جمع تھے۔ بار بار انہیں توجہ دلائی گئی "بھائی شہر جل رہا ہے۔ خدا کے لے ایک نگاہ غلط ادھر بھی ڈالیے۔" وہ لوگ "سیاہ" "ست" میں الجھے رہے۔ ڈنر اور لنچ اڑاتے اور خبریں سنتے رہے جبکہ شہر میں کرفیو میں فاقوں کے نتیجہ میں اور چھرا زنی سے لوگوں کی قبریں بنتی رہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ وقت گذر جاتا ہے روکے نہیں رکتا، سو اس سال بھی ستمبر کا مہینہ گذر گیا۔ بارش اور طغیانی کے دن ختم ہوئے۔ جلوسوں، فسادات اور کرفیو کا مہینہ بیت گیا۔ سیاسی طوفان اور اقتدار کی رسہ کشی کا مہینہ نکل گیا۔ بارش نہیں ہوئی۔ خشک سالی کا دور دورہ ہوا۔ جلوس نکلے، فساد ہوا، کرفیو نافذ ہوا اور پھر امن و امان بحال ہوا۔ دوسرے مقامات کے تماشائی اپنے اپنے گھر سدھارے۔ خصوصی پولس نے رخت سفر باندھا اور ہم حیدرآبادی روزمرہ کے کام کاج میں جٹ گئے ------۔ زندگی باقی رہی تو آئندہ سال ستمبر کے ستم دیکھیں گے۔

اکتوبر۔ ۱۹۸۴ء

اٹھاون، پچپن اور تیس، تینتیس

ہندسوں اور صفر کی ایجاد سے انسان علم رمل میں الجھا ہوا ہے ۔ اپنی تقدیر کو اعداد کے ذریعے کبھی سلجھاتا تو کبھی الجھاتا ہے ۔ ہم میٹرک میں چھ مرتبہ اس لئے فیل ہوئے کہ ہال ٹکٹ نمبر کا حاصل جفت عدد نکلتا تھا ۔ ساتویں مرتبہ ہال ٹکٹ نمبر کا حاصل طاق عدد تھا لیکن ساتویں مرتبہ امتحان لکھنے کی پاداش میں کامیاب نہ ہوسکے ۔ آٹھویں بار ہال ٹکٹ نمبر کا حاصل طاق عدد تھا اسی لئے رعایتی نشانات سے پاس ہوئے ۔ ہمارے ایک ساتھی صرف اسی بس میں سفر کرتے ہیں جس کے نمبر کا حاصل جفت عدد نکلتا ہے ۔ ان کی دانست میں جفت عدد کی بنا پر وہ حادثات سے محفوظ رہتے ہیں ۔ علم رمل میں گرفتاری اور پریشانی کی یہ دو انفرادی مثالیں تھیں ۔ ہمارے شہر میں پچھلے تین سال سے ملازمین سرکار اجتماعی طور پر ہندسوں کے چکر کا شکار ہوئے ۔

ایک قانون نافذ ہوا جس کی رو سے ملازمین سرکار کی وظیفے پر سبکدوشی کی عمر جفت عدد اٹھاون سال سے طاق عدد، پچپن سال کر دی گئی ۔ کہا گیا کہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری کو ختم کرنے کی سمت ایک اہم قدم ہے ۔ آناً فاناً زندگی کی پچپن بہاریں دیکھ لینے والے ملازمین کو ریٹائر کر دیا گیا ۔ کم عمر ملازمین کو ترقی ملی، وہ خوش ہوئے ۔ بے روزگار نوجوانوں کو سبز باغ دکھلائے گئے ۔ نوجوان خواب سجانے لگے کہ اب انہیں نوکری اور پھر چھوکری ملے گی ۔ یہ تاثر بھی ملا کہ پچپن سال کی عمر کے بعد لوگ ناکارہ ہو جاتے ہیں ۔ جولانی باقی نہیں رہتی ۔ کام کرنے کی صلاحیتیں معدوم ہو جاتی ہیں ۔ دفاتر اور حکومت کی بہتر کارکردگی کے لئے نوجوانوں کی ضرورت ہے ۔ GENERATION GAP زیادہ گہرا ہوا ۔ نوجوان بزرگوں کو شاندار مستقبل کی راہ میں حائل سمجھنے لگے اور جو حضرات ریٹائر ہوئے انہیں کچھ سجھائی نہ دیا ۔ ہمیں یاد ہے ہمارے ایک بزرگ کی بیوی نے ان سے کہا تھا "آپ ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں زندگی سے سنیاس نہیں لیا ہے ۔"

زندگی کی شروعات بچپن سے ہوتی ہے۔ جوانی کے آغاز کی طبعی نشانیاں ہوتی ہیں لیکن پتہ نہیں چلتا کہ بڑھاپا کب آتا ہے۔ بعض اشخاص کے نزدیک بڑھاپا ایک احساس ہے، جب محسوس کریں تب سے بوڑھے ہوگئے۔ بڑھاپا محسوس کئے بغیر لوگ موت تک جوان رہتے ہیں۔ چند نشانیوں کو بڑھاپے کی آمد سمجھا جاتا ہے۔ بال سفید ہونا، بال گرنے لگنا، چہرے پر جھریاں نمودار ہونا، کمزوری وغیرہ۔ کہنہ، نزلہ زکام سے جوانی میں بال گرنے اور سفید ہونے لگتے ہیں۔ تفکرات کی بدولت وقت سے پہلے چہرے پر جھریاں نمودار ہوتی ہیں اور کمزور تو ہم بچپن سے ہیں۔ ہماری دانست میں ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد بڑھاپا شروع ہوتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی مصروفیت نہیں رہتی، کہیں آنا اور نہ کہیں جانا۔ اپنے آپ کو تر و تازہ بنا کر رکھنے کی خواہش ختم ہوجاتی ہے۔ کمر خود بخود جھک جاتی ہے۔ اعضاء جواب دینے لگتے ہیں۔ طبعیت عبادت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک گھر پر پڑے خبریں سننا، اخبار پڑھنا اور اپنے جیسے دوسرے ریٹائرڈ اصحاب سے بحث و مباحثہ کرنا تمام دن کی مصروفیت ہوتی ہے۔ گھر کے وہ کام کاج انجام دینے پڑتے ہیں جو دوران ملازمت نظر انداز کردیئے جاتے تھے۔ راشن لانا پڑتا ہے۔ بجلی اور نل کا بل داخل کرنا پڑتا ہے، بچوں کو اسکول لے جانا اور لانا پڑتا ہے۔ بوڑھاپا اور ریٹائرمنٹ سکے کے دو رخ ہیں۔ قانون کی مدد سے ملازمین کو اٹھاون کے بجائے پچپن سال کی عمر میں سبکدوش کردیا گیا ہے تو گویا بڑھاپا تین سال قبل آگیا۔ بہت ظلم ہوا۔ نعمتوں سے محروم کرکے بڑھاپے کی زحمتوں سے آشنا کیا گیا۔ چند ملازمین سے یہ ظلم برداشت نہ ہوسکا اور ریٹائر کردیئے جانے پر داعی اجل کو لبیک کہا۔

ملازمین کی زندگی محدود آمدنی اور وسائل کے چوکھٹے میں سوچ سمجھ کر پلاننگ کے ساتھ دھیرے دھیرے رینگ رہی تھی کہ اس فیصلے سے جیسے بریک ڈاون ہوگیا۔ ہمارے ایک دوست نے بتلایا "مکان کی اقساط باندھنی ہیں، ٹی وی کی چند قسطیں واجب الادا ہیں۔ بچوں کی فیس ہے، وظیفے سے یہ رقم ادا کرنے کے بعد کھانے کے لئے ہوا باقی رہے گی۔" ملازمت کی دھاک پر ضروریات زندگی ماہانہ آسان اقساط پر خریدا کرتے ہیں۔ یوں بھی ایک ملازم کی زندگی اقساط میں ہی گذرتی ہے۔ مہنگائی الاونس قسطوں میں بڑھتا ہے۔ سالانہ قسط وار تنخواہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ گریجویٹی کو ملازم قسط وار جمع کرواتا ہے۔ ملازم اپنی زندگی میں صرف قرض یکمشت حاصل کرتا ہے جسے وہ قسطوں میں چکاتا ہے۔ ملازمت میں دن دونی رات چوگنی ترقی کا امکان نہیں رہتا۔ اب اس فیصلہ سے تمام قسط وار مسائل یکمشت گلے آن پڑے۔ قرض خواہ پہلی تاریخ کا خیال کئے بغیر گھر کے چکر کاٹنے لگے ہیں۔

سرکاری ملازمین کو چند فائدے بھی حاصل ہیں۔ نئے فیصلے کے تحت حاصل شدہ سہولتوں سے ملازمین تین سال قبل محروم کردیئے گئے۔ گزیٹیڈ ملازمین کی دستخط کا دم خم تین سال پہلے ختم ہوا۔ سرکاری ملازمین کی ضمانت مسلمہ ہے، ضمانت دینے کے حق سے ملازمین تین سال پہلے محروم ہوئے۔ سماج میں سرکاری ملازم کی حیثیت سے جو اثر و رسوخ تھا وہ بھی تین برس قبل زائل ہوا۔ ہم ایک صاحب سے واقف ہیں جن کی لڑکی کا رشتہ ریٹائرڈ ہونے پر توڑ دیا گیا۔ دولھے والوں کو خوف تھا کہ ریٹائرڈ ملازم نہ آن بان

اور شان سے شادی کر سکے گا اور نہ ہی داماد کی خاطر خواہ میزبانی کر سکے گا، جس طرح بر سر خدمت ملازم سرکار کر سکتا ہے، خصوصاً ایسا ملازم جس کو بالائی آمدنی کا دست غیب بھی حاصل ہو!

ہمارے ایک دوست منطق میں ماہر ہیں۔ انہوں نے اس فیصلے پر ہر کسی سے بحث شروع کر دی۔ "عجیب مذاق ہے۔ ملازمت میں بھرتی کی عمر میں اضافہ کیا جارہا ہے۔ پچیس سال سے بڑھ کر حد عمر اب تیس سال ہو گئی ہے۔ فرض کیجئے میری عمر تیس سال ہے۔ لاکھوں بے روزگار لوگوں میں سے ایک ہوں۔ مشکل سے ملازمت ملی۔ شادی کی اور فیملی پلاننگ پر سختی سے عمل کرتے ہوئے صرف دو بچے پیدا کئے۔ میری عمر چالیس سال ہو گئی اور جب میں ریٹائر ہوا اس وقت بچوں کی عمر پندرہ، سولہ برس کے آس پاس ہو گی۔ وظیفہ یاب شخص بچوں کی پرورش کرے تو کیوں کر؟ زندگی کی اوسط عمر بڑھ رہی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک طویل عرصہ زندگی گذارنا آسان نہیں ہوتا۔ حقائق کی روشنی میں وظیفے پر سبکدوشی کی عمر میں اضافہ ہونا چاہئے تھا لیکن حیراں ہوں کہ روؤں دل کو کہ پیٹوں جگر کو میں۔"

وظیفہ پر سبکدوشی کی عمر میں کمی کے فیصلہ پر عمل کیا گیا۔ دفاتر سے کئی ملازمین ریٹائر ہوئے محسوس ہوتا تھا کہ دفاتر میں ایک وبائی مرض پھیل گیا ہے جو ملازمین کا شکار کرتا جارہا ہے۔ کئی آسامیاں خالی ہوئیں۔ کچھ لوگوں کو ترقی ملی، وہ خوش بلکہ بہت خوش ہوئے۔ ایک صاحب نے اپنی ترقی کی خوشی میں دعوت کی، ہر ایک سے خوشی خوشی کہتے "عمر تمام کلرکی کرتا رہا۔ ناظم کا ارمان لئے شاید ریٹائرڈ ہو جاتا، بھلا ہو اس فیصلے کا جس نے ترقی کی راہیں کھول دیں۔" نوجوان پر امید تھے کہ انہیں ملازمت ملے گی۔ وہ دفاتر کے چکر کاٹنے لگے جہاں کام ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ آیارام اور گیارام کہاوت صادق آنے لگی۔ کام کاج سے زیادہ جانے والوں کی وداعی پارٹیاں اور آنے والوں کے لئے تہنیتی جلسے منعقد ہونے لگے۔ جس ملازم کو دیکھئے وہ اپنی عمر اور وظیفے کا حساب کئے آئندہ کی پلاننگ میں مصروف ہے۔ ہم ایک دفتر گئے۔ صرف چپراسی موجود تھا۔ اس نے بتلایا "بڑے صاحب، پچپن پر ریٹائر ہوئے۔ چھوٹے صاحب کا ترقی ملنے کے بعد تبادلہ ہوا۔ بڑے بابو تین ماہ بعد پچپن سال کے ہوں گے وہ وظیفے کی کارروائی کے لیے گئے ہیں۔ چھوٹے بابو خالی آسامی پر اپنے سالے کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ کام نہ ہونے کی وجہہ سے ٹائپسٹ مارننگ شو دیکھنے گئے ہیں چونکہ میں دفتر کھولتا اور بند کرتا ہوں اس لئے موجود ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت!"

ملازمین ابھی فیصلے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ ایک اور بری خبر عام ہونے لگی کہ جس ملازم نے تیس یا تینتیس سال خدمت کی ہے اسے بھی لازمی طور پر سبکدوش کر دیا جائے گا۔ ملازمین پھر سے علم رمل کا شکار ہوتے نظر آئے۔ ملازمین اپنی عمر عزیز دیکھنے کے بعد ملازمت کی عمر کا حساب لگاتے، جو ملازمین اٹھاون سے پچپن کی مار سے بچ رہے وہ تیس تینتیس کی چکر میں آرہے تھے۔ ایسا محسوس ہونے لگا، دفاتر کے بہتیرے ملازمین ریٹائر ہو جائیں گے۔ چند نوجوان ملازمین بچ رہیں گے جن کی عمر چیونگم چپانے، دفتر سے غائب ہو کر فلمیں دیکھنے اور عشق بگھارنے کی ہو گی لیکن خدا کا فضل رہا کہ ایسا کوئی قانون بن نہیں پایا اور وہ صرف افواہ ٹھہری۔ ہمارے شہر کو افواہیں پھیلانے میں بھی بڑا ملکہ حاصل ہے۔

پچپن سال کی عمر پر سبکدوش کر دیئے جانے والے ملازمین کے وظیفے کی کارروائیاں مختلف دفاتر کے چکر لگارہی تھیں، ترقی حاصل کرنے والے ملازمین خوشیاں منارہے تھے، اور بے روزگاروں کی جھولیاں بھری بھی نہ تھیں کہ اعداد و شمار میں تغیر آگیا۔ وظیفے پر سبکدوشی کی عمر پچپن سال سے پھر اٹھاون سال کر دی گئی۔ اکثر ملازمین کو واپس خدمت پر لے لیا گیا۔ دفاتر میں افراتفری مچی۔ چند مہینے وظیفہ یاب زندگی گزارنے کے بعد پھر سے ملازمین اپنی جگہ واپس ہوئے جہاں کوئی اور ترقی یا تبادلہ ہو کر آیا تھا۔ ایک کرسی کے دو حقدار ہوئے۔ ایک میان میں دو تلواروں کی کیفیت تھی۔ مثل پر ایک آفیسر جو لکھتا دوسرا اسے نفی کرتا۔ ماتحت پریشان کس کا حکم بجالائیں۔ مضحکہ خیز صورت حال صرف دفاتر ہی میں نہیں ہمارے شہر کی سیاست کی بھی تھی۔ کرسی ایک تھی اور دعویدار دو۔

چند سبکدوش ملازمین ایسے بھی تھے جو رجوع بکار ہونے کے احکام کے باوجود رجوع نہیں ہوئے۔ مختلف وجوہات تھیں۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا "جب میں ریٹائر ہوا، میرے ساتھی پہلی مرتبہ ہمدردی سے پیش آئے۔ دلاسہ بلکہ پرسہ دیا۔ بڑھ چڑھ کر چندہ کیا۔ جمع شدہ چندے سے شاندار پارٹی اور قیمتی تحفہ دیا۔ اب میں رجوع ہو کر خود کو شرمندہ اور دوسروں کو پژمردہ کرنا نہیں چاہتا۔" ایک اور صاحب نے کہا "میں نے ترکاری کی دکان کھولی ہے۔ تنخواہ سے زائد آمدنی ہو جاتی ہے۔"

پیالی میں طوفان جو پچپن، اٹھاون اور تیس تینتیس کی وجہ سے اٹھا تھا اب تھم چکا ہے۔ لوگ صدمے اٹھائے، پریشان ہوئے اور آخر میں سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہم نے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر فیصلہ کیا ہے کہ اپنے بچوں کو ایسے پیشے سے وابستہ کریں گے جس میں عمر کی قید نہ ہو۔ سوچ بچار کے بعد دو میدان ایسے نظر آئے جہاں عمر کی قید نہیں ہے۔ ایک اداکاری اور دوسرا سیاست۔ اداکاری آپ بچپن سے کر سکتے ہیں۔ جوانی میں بڑھاپے اور بڑھاپے میں جوانی کا رول ادا کر سکتے ہیں۔ اداکار اگر مرد ہو تو پھر کیا کہنا محبوبہ کا رول ادا کرنے والی اداکارہ، ماں کا رول بھی کرتی ہے۔ ساٹھ سال کا ہیرو سولہ سالہ لڑکے کی اداکاری کرتا اور داد پاتا ہے۔ "بڑھاپے میں جوانی" کے باوجود اگر دم خم باقی نہیں ہے، ڈھول کی تھاپ پر ناچ نہیں سکتے تو سیاست میں داخل ہو سکتے ہیں۔ انگلیوں پر دوسروں کو نچا سکتے ہیں۔ سیاست سے عمر رسیدہ اور تجربہ کار لوگ وابستہ رہتے ہیں لیکن آج اس میں نئے خون کی شدید ضرورت ہے۔ ہم نے اپنے لڑکے کو جو کنڈر گارڈن میں پڑھتا ہے تاکید کی ہے کہ وہ کلاس کا مانیٹر بنے اور اسکول کے ہر ڈرامے میں حصہ لے ۔۔۔۔ تاکہ اس کا مستقبل درخشاں ہو۔

اکتوبر ۔ ۱۹۸۵ء

امتحان

زندگی میں ہر قدم اور ہر مرحلے پر ایک امتحان سے گذرنا پڑتا ہے ۔ امتحانوں کی شروعات تعلیمی میدان سے ہوتی ہیں ۔ تعلیمی امتحان کردار اور قابلیت کا پیمانہ ہیں جو انسان کے مستقبل کی بنیاد بنتے ہے ۔ ماضی میں تعلیم حاصل کرنا اور امتحان دینا ایک مقدس فریضہ تھا ۔ استاد کی بارگاہ میں زانوئے ادب تہہ کرکے عقیدت کے ساتھ علم حاصل کیا جاتا تھا ۔ آج زندگی کی اقدار بدل چکی ہیں ۔ طالب علموں نے STUDY AND STRUGGLE کا نعرہ وضع کرلیا اور پڑھائی کے ساتھ جدوجہد کرنا اپنا شعار بنالیا ہے ۔ ہمارے خیال میں آج طالب علم امتحان کے لئے تو جہاد کرتے ہیں ۔ پڑھائی کے لئے طالب علم کے پاس وقت نہیں ہے ۔ تعلیمی سال کے آغاز میں ہڑتالیں ہوتی ہیں ۔ ہڑتالیں ختم ہونے کے بعد اسٹوڈنٹس یونین کے انتخابات منعقد ہوتے ہیں ۔ انتخابات کی گڑبڑ سے اکثر اسکول اور کالج بند ہوجاتے ہیں ۔ جو اسکول اور کالج بند نہیں ہوتے وہاں انتخابات کے بعد طالب علم ایجوکیشنل ٹور پر روانہ ہوجاتے ہیں ۔ ان مصروفیات کے علاوہ وقتاً فوقتاً کثیر تعداد میں چھٹیاں ملتی ہیں ۔ طالب علم کو وقت ہی نہیں ملتا کہ وہ پڑھ لکھ کر امتحان دے ۔ " محبت ، جنگ اور امتحان میں سب جائز ہے " پر عمل کرتے ہوئے طالب علم نقل کرنے سے لے کر پرچے تک اوٹ کرتے ہیں اور جب کچھ کر نہیں پاتے تو امتحان کا بائیکاٹ ضرور کرتے ہیں ۔

ہمارے شہر میں امتحان کی تیاری کے انداز بدل چکے ہیں ۔ کوئی طالب علم پڑھتا لکھتا دکھائی نہیں دیتا ۔ نوٹس تیار کرنے کی فکر کسی کو نہیں رہتی ۔ اس کے برخلاف امتحان سے پہلے طالب علم کھاپی کر اپنا وزن بڑھاتے ہیں ۔ ورزش کرتے اور کراٹے سیکھتے ہیں ۔ ڈاڑھی مونچھ اور سر کے بالوں کو بے تحاشہ بڑھاتے ہیں ۔ سیدھے منہ بات نہیں کرتے ۔ ہر دم لڑائی جھگڑے کے لئے تیار رہتے ہیں ۔ قصہ مختصر طالب علم امتحان سے پہلے خوفناک نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ نگران کار ان کے قریب نہ آئیں ۔ امتحان کے دوران ہم اپنے لڑکے سے خوف زدہ رہتے ہیں ۔ دبے الفاظ میں بھی اسے نقل سے باز رہنے کے لئے نصیحت

کرنے کی ہمت ہم اپنے اندر نہیں پاتے۔ امتحان کے دوران ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کا انتخاب کیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ نوٹس اور گائیڈس ان میں چھپا سکیں۔ ہمارے ایک دوست موٹے ہیں۔ امتحان کے دوران ہر کوئی ان سے کپڑے مانگنے آتا ہے۔ امتحان سے قبل طالب علم قلم کے ساتھ کھٹکے والا رام پوری چاقو خریدتے ہیں تاکہ چاقو کے زور پر قلم چلا سکیں۔ گائیڈس خریدنا بھی امتحان کی تیاری میں شامل ہے۔ کتابوں سے زیادہ گائیڈس بکتی ہیں۔ ہر مضمون کی شرح چھوٹی سی چھوٹی سائز میں دستیاب ہے۔ پاکٹ گائیڈ، منی گائیڈ حتی کہ بنیئے میں چھپانے کے لئے گائیڈ بھی شہر کے بازاروں میں ملنے لگی ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب نقل کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ نقل کرنے کے لئے جتن کئے جاتے تھے۔ جواب چھوٹی پرچیوں پر باریک قلم سے احتیاط کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔ نقل کی پرچیوں کو چھپاکر امتحان ہال میں لے جایا کرتے تھے۔ ڈرتے ہوئے چوری چھپے، نقل کرتے تھے۔ پکڑے جانے پر بے عزتی کے ساتھ امتحان ہال سے باہر کر دیئے جاتے تھے۔ لیکن آج ہمارے شہر میں دھڑلے کے ساتھ نقل کی جاتی ہے۔ کئی گھنٹے برباد اور آنکھیں خراب کر کے باریک خط میں چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ امتحان ہال میں طالب علم کتابیں گائیڈس اور نوٹس جیبوں میں بھر کر لے جاتے ہیں اور کھلے عام نقل کرتے ہیں۔ نگران کار بے بسی سے کسی کونے میں کھڑے امتحان ہال سے باہر فضا میں گھورتے رہتے ہیں جیسے ماضی کو تلاش کر رہے ہوں۔ کوئی نگران کار ہمت کر کے نقل سے منع کرتا ہے تو پھر اس بے چارے کی خیر نہیں "باہر نکلنے" کے بعد اسے "دیکھ" لیا جاتا ہے حالانکہ نقل کو روکنے کے لئے مختلف اقدامات کئے جاتے ہیں۔ امتحان ہال میں داخلے سے قبل طالب علم کی مکمل جامہ تلاشی لی جاتی ہے۔ نگران کار کے علاوہ مختلف دستے تشکیل دیئے جاتے ہیں۔

امتحان ہال کے باہر سے کی جانے والی مدد کو ہم لارن ایڈ کہتے ہیں۔ خارجی مدد حساب کے مضمون کے لئے بے حد ضروری ہے۔ لارن ایڈ پہنچانے کے لئے طالب علم کے عزیز و اقارب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ امتحان ہال کے محل وقوع کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پلاننگ ہوتی ہے۔ کس طرح اور کیسے پرچے کو باہر اسمگل کیا جائے اور پھر باہر سے حل کیا ہوا پرچہ اندر پہنچایا جائے۔ امتحان شروع ہوتے ہی پرچہ باہر آجاتا ہے۔ پرچہ حل کرنے کے لئے ماہرین امتحان ہال کے قریب مقام کئے ہوتے ہیں۔ ماہرین سے پرچہ حل کرواکے واپس یکمشت یا اقساط میں طالب علم کے پاس پہنچایا جاتا ہے۔ ہم ایک صاحب کو جانتے ہیں جنہوں نے پیر کی ہڈی تڑواکر اپنے بچے کی ساتویں جماعت کامیاب کروانے میں مدد کی تھی۔

نقل کے لئے بھی عقل چاہیئے۔ گائیڈس، نوٹس اور کتابوں سے لیس اور خارجی مدد کے باوجود بعض طالب علم نقل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ایک نگران کار نے ہمیں یہ واقعہ سنایا "امتحان ہال میں نقل عام ہو رہی تھی۔ ایک طالب علم گائیڈ کھولے ناخن کتر رہا تھا۔ سبب دریافت کرنے پر اس نے بتلایا کہ گائیڈ میں جواب نہیں مل رہا ہے۔ میں نے گائیڈ میں جواب تلاش کر کے دیا۔ کچھ دیر بعد وہی طالب علم پھر سے ناخن کترتا نظر آیا۔ پوچھنے پر اس نے درخواست کی کہ نشان کھو گیا ہے پھر سے تلاش کر کے دیں۔"

امتحان کا ڈر اور خوف پرچہ سوالات سے قائم تھا۔ دعائیں مانگی جاتی تھیں کہ من پسند سوالات آئیں پیسے خیرات کئے جاتے تھے کہ مشکل سوالات سے جان چھوٹے۔ نگران کار کو دیکھتے ہی وظیفے کا ورد شروع ہو جاتا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے پرچہ لیتے اور اکثر ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے تھے۔ آج ہمارے شہر میں طالب علموں کو امتحانی پرچے کا کوئی خوف نہیں ہے۔ طالب علم امتحانی پرچے کو وقت سے پہلے "آوٹ" کر لیتے ہیں پرچہ امتحان ہال کے بجائے وقت سے پہلے افشا ہو کر طلباء برادری میں فروخت ہونے لگتا ہے۔ طالب علم پرچہ حاصل کر کے خود اعتمادی سے امتحان ہال میں حل کرتے ہیں۔ ہمارے شہر نے پرچہ اوٹ کرنے کی ایک تاریخ بنائی ہے۔ چند سال قبل میٹرک کے امتحان کا اوٹ کیا ہوا ایک پرچہ شہر کے مشہور روزنامے میں چھپ چکا ہے۔ طلباء برداری نے اخبار کے اس جذبہ خیر سگالی کو کافی سراہا اور محکمہ تعلیمات کے احسان مند رہے جنہوں نے اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی پرچے کو منسوخ نہیں کیا۔

وہ زمانہ بیت گیا جب امتحان کا موسم طلباء کے لئے وبال جان ہوا کرتا تھا۔ امتحان کے ڈر سے کسی کو بخار تو کسی کو دست آتے تھے۔ پڑھائی مکمل نہ ہونے کی وجہ سے طالب علم روتے تھے۔ نتیجے کے خوف سے بھوک مٹ جاتی تھی۔ پڑھتے پڑھتے دبلے ہو جاتے تھے۔ آج بساط الٹ چکی ہے۔ امتحان کے موسم میں طالب علم عیش کرتے ہیں۔ نتیجے سے بے فکر اور بے نیاز رہتے ہیں جبکہ اساتذہ کی حالت امتحان کے موسم میں قابل رحم ہوتی ہے۔ اکثر اساتذہ، نگران کار بننے سے بچنے کے لئے بیمار پڑ جاتے ہیں۔ ہم ایک ٹیچر سے واقف ہیں جو سال بھر بھلے چنگے رہتے ہیں لیکن اپریل اور مئی کے مہینوں میں بخار، کھانسی، دست، درد شکم اور بھی کئی تکالیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جون کے مہینے میں امتحانات ختم ہوتے ہیں تو موصوف کی صحت بھی بہتر ہونے لگتی ہے۔ اساتذہ کی بوکھلاہٹ امتحانی پرچوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ غیر نصابی سوالات پوچھنے کی عام شکایت ہے۔ غلط سوالات بھی پوچھتے ہیں۔ اردو کے پرچے تو غلطیوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔

ہمارے شہر میں امن قائم رکھنے کے لئے عبادت گھروں، اسکولوں اور کالجوں پر پولس کا مستقل بندوبست رہتا ہے۔ انتخابات اور امتحانات کے دوران تعلیمی اداروں کے پاس پولس کا پہرہ سخت کر دیا جاتا ہے۔ پولس تعلیمی اداروں کا محاصرہ کر لیتی ہے۔ اطراف میں کسی کو ٹھہرنے نہیں دیا جاتا۔ باہر سے مدد کرنے والوں کا تعاقب کر کے بھگا دیا جاتا ہے۔ کالج کے ایک استاد کو ہم نے پولس والے سے کہتے سنا "بھائی آپ لوگ خوش قسمت ہیں۔ امتحان ہال میں آپ کا داخلہ ممنوع ہے۔ حفاظت خود اختیاری کے لئے آپ کے پاس ہتھیار اور قانون ہے جبکہ ہمیں نہتے ہو کر طلبا کی نگرانی کرنی پڑتی ہے۔ انہیں نقل سے باز رکھنا بھوکے شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔"

امتحانات کا انعقاد اگر طالب علموں کے حسب منشا ہو تو امن و سکون قائم رہتا ہے، ورنہ برہم طلبا امتحانی پرچے اور جوابی بیاضیات کو پھاڑ کر ممتحنوں کی پٹائی کر کے زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے اسکول اور کالج سے باہر آکر پتھراؤ کرنے لگتے ہیں۔ ایسے حالات میں پولس کی مدد ناگزیر ہو جاتی ہے۔

ہمارے ایک دوست نے کہا تھا "نقل عام کو روکنے کے لئے موجودہ طریقہ امتحان میں زبردست

تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے خیال میں اس سے پہلے تعلیمی نظام میں انقلابی اصلاحات درکار ہیں۔ ہمارے شہر میں تعلیمی نظام خود ایک امتحانی دور سے گذر رہا ہے بلکہ شروع ہی سے امتحانی دور چل رہا ہے۔ مختلف فارمولے اپنائے گئے۔ کبھی گیارہ جمع دو جمع دو تو کبھی گیارہ جمع ایک جمع تین اپنایا گیا۔ ان دو فارمولوں کے ناکام ہونے پر فارمولہ بارہ جمع تین آزمایا گیا۔ آج دس جمع دو جمع تین فارمولہ چل رہا ہے۔ امتحان کے لئے بھی کئی طریقے اپنائے گئے۔ کبھی ماہواری، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحانات ہوئے تو کبھی ٹرائی میسٹر اور سمسٹر نظام رائج رہا۔ کہیں انٹرنل اسسمنٹ ہے تو کہیں نتائج بالکلیہ ایک امتحان پر تکیہ کرتے ہیں۔ تعلیمی نظام اور طریقۂ امتحان میں الجھنوں اور پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کے لے ہم گریجویشن کے لئے پندرہ جمع صفر کا فارمولہ پیش کرتے ہیں۔ صفر سے ہماری مراد ہے امتحان منعقد نہ کرنا!

مئی۔ ۱۹۸۵ء

چائے خانے

بے کاری اور بے روزگاری سے جو کاروبار ترقی کرتے ہیں ان میں چائے خانے سرفہرست ہیں۔ چائے خانے وہ مقامات ہیں جہاں درجنوں "کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے" قسم کے لوگ گھنٹوں بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں اور محفل برخواست کرتے وقت تبرکاً دو پیالی چائے پیتے ہیں۔ چائے خانوں کے ساتھ پان کے ڈبوں کا ہونا ضروری ہے۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ ہمارے شہر میں چائے خانے معہ پان کے ڈبے ہر فرلانگ پر ملتے ہیں جو دن کے چوبیس گھنٹے کھلے رہتے ہیں۔ لائسنس ضبط ہونے پر بھی چائے خانے بند ہوتے نظر نہیں آتے۔

چائے خانے پر بہت بڑا سائن بورڈ لگا ہوتا ہے۔ ڈھیر سارے رنگوں سے بورڈ کو جاذب نظر تو نہیں مگر چُرنگی ضرور بنا دیا جاتا ہے۔ صرف یہی چائے خانے کی بہترین شئے ہوتی ہے وہ بھی اس لئے کہ بورڈ چائے خانے کی ملکیت نہیں ہوتا۔ سائن بورڈ کو کسی چائے کی پتی، مشروبات یا بسکٹ تیار کرنے والی فیکٹری اپنے خرچ پر اشتہار کے لئے تیار کرواتی ہے۔ چائے خانے کا نام ایک کونے میں صلہ احسان بنا ہوا ہوتا ہے، جس کا بدلہ چائے خانے والے اشتہار والی شئے کو اپنے پاس نہ رکھ کر چکاتے ہیں۔

باہر سے چائے خانے کا صرف دروازہ نظر آتا ہے۔ اندر روشنی کم ہونے کے سبب باہر کچھ نظر نہیں آتا۔ چائے خانے میں دروازے کے پاس کچھ دیر ٹھہر کر اندر جانا پڑتا ہے۔ آنکھیں چائے خانے کی محدود روشنی سے سمجھوتہ نہیں کر پاتیں۔ ماحول سے مانوس ہونے کے بعد دروازے کے دونوں جانب دو بڑے شوکیس نظر آتے ہیں۔ ایک شوکیس میں سلیقہ سے کراکری سجی ہوتی ہے۔ یہ کراکری چائے خانے میں استعمال نہیں ہوتی بلکہ نمائشی ہوتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کراکری شاید چائے خانے کی ملکیت بھی نہیں ہوتی۔ دوسرے شوکیس میں مختلف کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں یقیناً بکاؤ ہوتی ہیں لیکن اتنی کم بکتی ہیں کہ ان پر بھی نمائشی اشیاء کا گمان گذرتا ہے۔ یہ شوکیس مکھیوں اور جھینگروں کا مسکن بھی

ہوتا ہے ۔ اسی شوکیس کے پیچھے ایک لمبا، چوڑا، موٹا تازہ، لحیم شحیم آدمی جس کی توند سانس کے ساتھ شوکیس کو آگے اور پیچھے ڈھکیلتی رہتی ہے، بیٹھا ہوتا ہے ۔ یہ آدمی نما گوشت کی دکان چائے خانے کا مالک ہے ۔ مالک کی توند کو دیکھ کر قیاس ہوتا ہے کہ چائے خانے کی ہر اچھی چیز بالخصوص بالائی اسی توند کی نذر ہوتی ہوگی ۔ مالک کی ایک جانب ٹیلیفون کا آلہ رکھا ہوتا ہے تو دوسری طرف ایک چھوٹا پنکھا چلتا رہتا ہے جو اس سیٹھ کے لئے اپنی تنگ دامنی کا شکوہ مختلف قسم کی آوازیں نکال کر کرتا ہے ۔

چائے خانے میں قدم رکھتے ہی گاہک کا استقبال مکھیاں، گلے، گال اور پیشانی کو چوم کر اور مچھر ہاتھ پیر پر ڈنک مار کر کرتے ہیں ۔ اندر احتیاط سے قدم بڑھانا پڑتا ہے ۔ فرش چکنا ہوتا ہے اور اس پر چائے اور پانی گاہک کو چاروں خانے چت کرنے کے لئے موجود رہتا ہے ۔ ایک مرتبہ تیزی سے ہم چائے خانے میں داخل ہوئے تھے جس کا نتیجہ ہماری چال سے ظاہر ہے ۔ چائے خانے میں داخل ہونے کے بعد گاہک گرمی سے بے بس ہوکر اوپر دیکھتے ہیں ۔ چائے خانے کی چھت کے بیچ میں صرف ایک عدد پنکھا ہوتا ہے جو چلتا نہیں بلکہ ٹہلتا ہے ۔ اس نعمت مترقبہ کے نیچے کئی لوگ بیٹھے ہوتے ہیں ۔ نووارد گاہک حتی الامکان ایسی میز پسند کرنا چاہے گا جو کھڑکی کی طرف ہوتی ہے لیکن چائے خانے میں کھڑکیاں نہیں ہوتیں کیونکہ بعض گاہک دروازے کی راہ سے آکر کھڑکی سے نکل جاتے ہیں ۔ مجبوراً گاہک گرمی سے بے چین ہوکر جہاں کہیں جگہ ملے بیٹھ جاتا ہے ۔ چائے خانے کی کرسیاں مخصوص اور نازک ہوتی ہیں ۔ جلد ہی چار سے تین اور دو پایہ والی کرسیاں بن جاتی ہیں ۔ چائے خانے کے مالک کو یہی لنگڑی کرسیاں عزیز ہوتی ہیں ۔ انہیں دیوار، میز یا کسی پتھر کے سہارے گاہک کو گرانے کے لئے کھڑا کیا جاتا ہے ۔ گاہک کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے بار بار گرتے ہیں خیر سے کوئی کرسی ٹھیک بھی رہے اور گاہک ہاتھ پیر پھیلا کر آرام سے بیٹھنا چاہے تو بیٹھ نہیں سکتا ۔ بیرا آکر وارننگ دے جاتا ہے "صاحب ٹھیک سے بیٹھو ۔ کرسی نئی ہے" ۔ وارننگ ملنے کے بعد گاہک صرف کرسی پر آرام کرنے کے بجائے میز کا بھی سہارا لینا چاہتا ہے ۔ ہاتھ رکھتے ہی میز گاہک کی گود میں آنے کے لیے جھولنے لگتا ہے ۔ گاہک غصے سے میز کی اس بد تمیزی کو دیکھتا ہے اور اس کا غصہ حیرت میں بدل جاتا ہے "چار لکڑیوں پر ایک پتھر" یہی تعریف چائے خانے کی میز کی ہوتی ہے ۔ لکڑی کئی جگہ سے تڑخی ہوئی ہوتی ہے تو پتھر چند ایک ٹکڑوں میں بٹا ہوتا ہے ۔ پتھر پر نام، لکیریں اور تصویریں کندہ ہوتی ہیں جو دراصل گاہکوں کی بیکاری کا مشغلہ ہوتا ہے ۔

چائے خانے میں بیٹھتے ہی گاہک سے مشاورت کے لئے مکھیاں آکر اٹکھیلیاں شروع کر دیتی ہیں ۔ کھٹمل خفیہ طور پر اور مچھر کانوں میں سریلے راگ الاپتے ہوئے للکار کر کاٹنے لگتے ہیں ۔ گاہک ادھر ادھر کھجاتے اور بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بیرے کو تلاش کرنے لگتا ہے ۔ بیرا نظر نہیں آتا لیکن بیرے کی تلاش میں گاہک پورے چائے خانے کا جائزہ لیتا ہے ۔ چائے خانے کی دیواروں کے لئے گہرا رنگ استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس سے دو فائدے ہیں ۔ پہلا فائدہ، گہرے رنگ سے گرمی میں اضافہ ہوتا ہے جو گاہک کو زیادہ دیر چائے خانے میں بیٹھنے نہیں دیتی ۔ دوسرا فائدہ، گہرا رنگ چائے خانے میں کم روشنی کا باعث بنتا ہے ۔

کم روشنی میں گاہک اچھے اور برے کی تمیز نہیں کر پاتا۔ چائے خانوں کی دیواروں پر چند ایک تختیاں لگی ہوتی ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے "یہاں ملازمین کو روز تنخواہیں دی جاتی ہیں۔" "مذہبی و سیاسی گفتگو نہ کیجئے"۔ "زاہد شکر اور پیالی طلب نہ فرمائیں"۔ "وقت کی قدر کیجئے۔" "دوسروں کے لئے جگہ بنائیے"۔ "یہاں پکوان اصلی گھی سے ہوتا ہے۔" محکمہ بلدیہ کی جانب سے دیا ہوا لائیسنس بھی دیوار پر لٹکایا جاتا ہے۔ نہ جانے کیوں اس کے اطراف مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں۔ کسی کونے میں اگر بتیاں جلتی رہتی ہیں۔ چائے خانے میں خوشبو انہیں اگر بتیوں سے ہوتی ہے، ورنہ چائے خانے کی ایک مخصوص بو ہوتی ہے جو یہاں زیادہ دیر بیٹھنے پر گاہک کے پاس سے بھی آنے لگتی ہے۔ چائے خانے میں حرف "چ" کا سکہ چلتا ہے۔ زیادہ بکنے والی شئے "چائے" ہے۔ میٹھی چیز کو "چیونٹیاں" لگتی ہیں۔ پکوان کی جگہ "چوہے" بکثرت پائے جاتے ہیں اور دیواروں پر "چپکلی" موجود رہتی ہے۔

چائے خانوں میں اکیلا گاہک بہت کم آتا ہے۔ گاہکوں کی ٹولیاں آتی ہیں۔ ایک مرتبہ ہم بیرے کا انتظار کرتے ہوئے اونگھنے لگے تھے کہ ایک زوردار گھنٹی بجی جس کی آواز پر صور اسرافیل کا گمان ہوا۔ ہم گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ تمام گناہ یاد آنے لگے۔ میدان حشر کے تصور سے کپکپی طاری ہوگئی۔ کچھ وقت گذرنے اور حالت سنبھلنے کے بعد پتہ چلا کہ چائے خانے کا مالک "باہر والے" کو بلانے کے لئے مسلسل گھنٹی بجا رہا تھا۔ باہر والا چائے خانے کی اشیاء کو برآمد کرتا ہے جس سے چائے خانوں کے نفع بخش اور وسیع کاروبار کا اندازہ ہوتا ہے۔

میز صاف کرنے کے لئے وقفے وقفے سے ایک لڑکا میلا اور گیلا کپڑا لئے آتا ہے اور میز صاف کرنے کے بجائے مزید خراب کر جاتا ہے۔ میز صاف ہونے کے بعد ایک نئی قسم کی بو آنے لگتی ہے۔ گاہک چائے خانے کے معیار صفائی پر غور کرنے لگتا ہے کہ اسے ایک کڑک دار آواز سنائی دیتی ہے "بولو۔۔۔ بولو صاحب۔" گاہک گردن اٹھا کر دیکھتا ہے۔ ایک نوجوان پتلون کے پائینچے چڑھائے، شرٹ کے بٹن کھولے، گردن میں دستی اور سر میں تیل ڈالے اور کان میں بیڑی سجائے کھڑا ہے۔ گلے میں سکوں سے بھری "چلر کی تھیلی" لٹک رہی ہے۔ یہ چائے خانے کا بیرا ہے۔ گاہک کے خاموش رہنے پر بیرا چلر پیسوں کی آواز پیدا کرتا ہے۔ گاہک کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلتی ہے "پانی۔" بیرا پکار کر کہتا ہے۔ "بچے عقل کے کچے۔ صاحب کو پانی پلا۔" ایک لڑکا پانی لئے آتا ہے۔ چائے خانوں میں پانی سپلائی کرنے کا ایک مخصوص اسٹائل ہے۔ پانی کے گلاسوں میں انگلیاں اور ہاتھ ڈبو کر پیش کیا جاتا ہے۔ پانی پلانے کے لئے الگ سے ایک لڑکا موجود رہتا ہے جو ایک ہاتھ میں چار تا پانچ گلاس پانی لے آتا ہے۔ پانی والا، گلاسوں کو میز پر رکھنے کے بعد اپنی انگلیوں اور ہاتھ کا پانی گاہک پر چھڑکتا ہے۔ پانی میں ساری بحری مخلوق جو گلاس میں سما سکتی موجود رہتی ہے گاہک پانی پینے کے لئے ہچکچاتا ہے کہ پانی والا آکر کہتا ہے "صاحب پانی پی لو۔ گلاس چاہئے" پانی پینے تک وہ گاہک کی جان پر کھڑا رہتا ہے۔

بیرے بخوبی جانتے ہیں کہ گاہک وقت گذارنے چائے خانے آتے ہیں۔ جب تک انہیں بلایا نہ

جائے وہ گاہک کے پاس دوبارہ نہیں آتے لیکن آواز سے اپنی موجودگی کا پتہ دیتے رہتے ہیں "ایک چائے، دو چائے، چار میں ایک پونہ ----پہلے سے ڈیڑھ، دوسرے سے تین پچاس - "ایک مرتبہ ہم صرف چائے اور بسکٹ کے لئے چائے خانہ گئے تھے - بیرے کو ڈھونڈ کر پوچھا "تازہ کیا ہے" جواب ملا "ہر چیز - یہاں صرف گاہک باسی ہوتے ہیں - "ہم نے بیرے کو ملانے کے لئے آرڈر دیا "چند بسکٹ اور چائے" بیرا چائے خانے کے اندھیرے میں گم ہوگیا - اس کی آواز آنے لگی "چار چائے لا - پانچ نمبر کے لئے بسکٹ لا ----" بیرا "چائے لا" کی ہانک لگاتا ہے لیکن لاتا وہی ہے - ہم بسکٹ اور چائے کا انتظار کرنے لگے - پلاسکٹ کی ایک پلیٹ میز پر پٹک دی گئی جس سے چند بسکٹ میز پر گر پڑے - گردن اٹھا کر دیکھا تو بیرا ایک ہاتھ میں پلاسٹک کی پلیٹیں اٹھائے اور دوسرے ہاتھ میں چار چھ چائے کی پیالیاں، طشتریاں اور کچھ کم دس خالی کپ لئے گاہکوں کو ان کی مطلوبہ اشیاء سپلائی کر رہا تھا - بسکٹ منہ میں رکھا ہی تھا کہ واہ واہ کا شور بلند ہوا - ایک شاعر لہک لہک کر اپنا تازہ کلام سنا رہے تھے - پتہ چلا کہ شاعر کو چائے خانے کی سرپرستی حاصل ہے اور چائے پی کر کلام کہتے ہیں - ادبی شہ پارے سے محظوظ ہوتے ہوئے بھی ہم بسکٹ کو چبا نہ سکے حالانکہ ساتھیوں میں ہمارے دانتوں کی دھوم ہے - ہمارے خیال میں پلاسٹک کی پلیٹ کو بسکٹ کی بہ نسبت آسانی سے چبایا جاسکتا تھا - بسکٹ چبانے کی کوشش میں پہلو بدلتے ہوئے ہماری نظر ایک کھدر پوش لیڈر پر پڑی جو میز پر چڑھے اپنے حامیوں کو چائے پلا کر دھواں دھار تقریر سے چائے کا معاوضہ وصول کر رہے تھے - چائے خانے کی اس لیڈر سے سیاسی وابستگی تھی - میز پر اخبار کا ایک ٹکڑا پڑا ملا - اٹھا کر دیکھنے سے پتہ چلا کہ وہ تازہ اخبار کا ایک حصہ ہے - ایسے چند اور ٹکڑے لوگوں کے پاس نظر آئے جنہیں بڑے انہماک سے پڑھا جارہا تھا - اخبار کے ٹکڑوں پر پانی اور چائے کے دھبے پڑے ہوئے تھے - ہمارے ایک دوست نے بتلایا کہ چائے خانوں میں اخبار نیپکن کا کام بھی دیتا ہے -

بسکٹ کھانے کی کوشش میں ہمارے دانتوں اور مسوڑوں میں درد ہونے لگا - بسکٹ کھانا ترک کرکے چائے کی طرف متوجہ ہوئے - چائے کا رنگ دیکھا تو جوہڑ کا گندہ پانی یاد آیا - آنکھ بند کرکے ہم نے چائے کا ایک گھونٹ پیا - جسمانی کیفیت ناقابل بیان تھی - روحانی طور پر ہم نے محسوس کیا کہ دوزخ میں گناہگاروں کو جو پانی پینے کے لئے دیا جائے گا وہ غالباً یہی چائے ہوگی - ہمت اور محنت کے باوجود ہم چائے کا دوسرا گھونٹ حلق سے اتار نہ سکے - ایک ہی گھونٹ میں دوزخ کی حقیقت عیاں ہونے پر ہماری حالت غیر ہونے لگی - جلد سے جلد چائے خانے کے باہر آنا چاہا - تیر کی طرح اٹھے اور کاؤنٹر کے پاس سیٹھ کے سامنے پہنچے بیرے کی آواز ہمارے پیچھے سے آئی - سیٹھ نے ہاتھ پھیلایا اور ہم نے بیرے کے حکم کی تعمیل کردی - چائے خانے سے باہر آنے اور ہوش ٹھکانے لگنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم نے زیادہ رقم ادا کی - بیرے نے کسی دوسرے بل کی صدا لگائی تھی جو ہم نے دے دی - بیروں کی پکار پر پیسے وصول کرنے کا انداز ہمارے شہر کے چائے خانوں کی آخری خوبی ہے جو اکثر گاہک کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے -

جولائی - ۱۹۸۳ء

ہمارے دواخانے

قدرت کے کارخانے میں ہر شئے کا جوڑ موجود ہے ۔ مرد کے لئے عورت تخلیق کی گئی تو دن کے لئے رات بنائی گئی ۔ گرمی کے ساتھ سردی تو آگ کے ساتھ پانی ۔ اسی طرح صحت کے ساتھ بیماری ہے ۔ انسان کبھی صحت مند رہتا ہے تو کبھی بیمار بھی پڑتا ہے ۔ صحت مندی کے مزے انسان خوب اٹھاتا ہے لیکن بیماری میں وہ فسانہ ، شکایت و تکلیف بن جاتا ہے ۔ ہم نے کسی کو بیماری کے مزے لوٹتے نہیں دیکھا حالانکہ بیماری کا بھی اپنا ایک ذائقہ ہے ۔ روزمرہ کے کام کاج چھوڑ کر بستر میں آرام سے رومانی ناول پڑھتے رہئیے ۔ یوں آپ احباب کی توجہ کے مستحق بھی بن جاتے ہیں ۔ وقت پر تازہ اور گرم کھانے کو ملتا ہے بیماری کی مخصوص غذا ، میوے ، دودھ ، ڈبل روٹی ، ہریرہ اور سوپ استعمال کرسکتے ہیں ، جو صحت مند کو میسر نہیں ہوتی ۔ بیماری کے فوائد کے باوجود کوئی بیمار نہیں ہونا چاہتا ۔ بیماری کو قہر ، عذاب اور ایک بلا سمجھتا ہے ۔ علاج پر جو پیسہ خرچ ہوتا ہے اسے اسراف جانتا ہے ۔ وجہ شاید ہمارے معالج اور دواخانے ہیں بیماری کو ہنسی خوشی برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن دواخانوں سے وابستگی ہمیں ہاتھ اٹھاکر دعا مانگنے پر مجبور کردیتی ہے ۔ " ھوالشافی ہمیں بیماری اور پھر شفا دے لیکن دواخانوں کے عتاب سے بچائے رکھ ۔ "

آپ نے محاورہ " ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ " سنا ہوگا اور استعمال بھی کیا ہوگا ۔ ہم نے اس محاورے کا عملی مظاہرہ دیکھا ہے ۔ ایک دوست کے بارے میں سنا کہ ان کی آنکھ کا آپریشن ہوا ، سو ہم عیادت کو پہنچے ۔ آنکھ پر پٹی کے ساتھ پیر بھی پلاسٹر میں جکڑا تھا ۔ پوچھنے پر انہوں نے بتلایا " آنکھ کے آپریشن کے لئے دواخانے گیا تھا وہاں باتھ روم میں پھسل کر اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا " ۔ ایک اور دوست نے شکایت کی " میں کھانسی کے لئے انجکشن لیا تھا ۔ کھانسی تو کم ہوئی لیکن انجکشن کی جگہ ایک پھوڑا بن گیا ہے ۔ اب اس کا علاج کروا رہا ہوں ۔ " بے جوڑ بیماریوں کا ساتھ ہونے کے علاوہ چند مخصوص بیماریاں دواخانہ آنے والوں کو متاثر کرتی ہیں ۔ ایک مرتبہ ہم عیادت کے لئے گئے تو ساتھ میں دواخانے سے انفکشن اٹھالائے جس نے ہمیں

ایک عرصے تک بیمار رکھا ۔ دواخانے میں مریضوں کی انفرادی بیماریاں مساوات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اجتماعی بیماریاں بن جاتی ہیں ۔ ہمارے ایک دوست دواخانے میں یرقان کے باعث شریک ہوئے ۔ دائیں بازو کے مریض کو ٹائیفائیڈ تھا ۔ تیسرے دن انہیں یرقان کے ساتھ ٹائیفائیڈ بھی ہوگیا ۔ اس سے پہلے کہ بائیں بازو والے مریض کا نمونیا انہیں متاثر کرتا وہ اپنی جان بچاکے گھر واپس آگئے ۔

غائب دماغی صرف پروفیسروں کی میراث نہیں ہے ۔ یہ طرہ ہر قابل شخص کے سر پر لگا ہوتا ہے ۔ ڈاکٹروں کی مثال لیجئے ۔ ایک انجکشن کے بجائے دوسرا انجکشن اور ایک مریض کی دوا دوسرے کو دے دینا معمولی باتیں ہیں ۔ ایک مرتبہ ہم بیگم کے لئے دوالانے ڈاکٹر کے پاس گئے ۔ تکالیف بیان کیں ۔ ڈاکٹر نے غور سے زنانی شکایات سنیں اور دوا تجویز کرکے ہم سے انجکشن لینے کو کہا ۔ ہم اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ڈاکٹر نے ہمیں انجکشن دے دیا ۔ جب ڈاکٹر پر حقیقت عیاں ہوئی تو فرمایا " گھبراہٹ کی بات نہیں ہے ۔ آپ کو " کیلشیت کا انجکشن " دیا گیا ہے ۔ مریض کی بیماری کے لے میری تجویز کردہ دوائیں استعمال کروائیے ۔ " یہ واقعہ آپ کو شاید لطیفہ لگے لیکن اب جو واقعہ ہم بیان کرنے جارہے ہیں اس کی شہرت دنیا بھر میں ہوچکی ہے ۔ ہمارے شہر کے ڈاکٹروں نے بیمار آنکھ کے بجائے صحت مند آنکھ نکال دی تھی ۔ چند دن قبل شہر کے ایک دواخانے میں آپریشن کرکے وہ قینچی برآمد کی گئی جو ایک دوسرے دواخانے کے ڈاکٹروں نے مریض کے پیٹ میں "فکسڈ ڈپازٹ" کی تھی ۔ یہ مثالیں ڈاکٹروں کی غائب دماغی کی تھیں ۔ نرسس کہاں پیچھے رہنے والی ہیں ۔ وٹامن کے شربت کے بجائے بچوں کو ڈیٹال پلایا گیا تھا ۔ اب آپ ہی بتلائیں ۔ جب ہمارے دواخانے اور معالجین ایسے ہوں تو ہم بیمار پڑنے سے کیوں نہ گھبرائیں ؟

علاج کے لئے ہمارے شہر میں دو قسم کے دواخانے اور معالج دستیاب ہیں ۔ سرکاری اور خانگی ۔ دونوں طرح سے علاج کروانے میں پیسہ خرچ ہوتا ہے ۔ فرق ضابطے کا ہے ۔ سرکاری علاج میں بے ضابطہ دینا پڑتا ہے جبکہ خانگی علاج میں روپیہ پیسہ ضابطے سے خرچ ہوتا ہے ۔ ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ خانگی دواخانوں سے مایوس ہوکر آخر میں مریض سرکاری دواخانے پہنچتے ہیں ، جہاں ان کی مایوسی ہمیشہ کے لئے ختم ہوجاتی ہے ۔ موت کے لئے یہ ایک قسم کا THROUGH PROPER CHANNEL راستہ ہے ۔ سرٹیفیکیٹ ملنے میں آسانی ہوتی ہے ۔ ہمارے شہر میں لوگ پیدا خانگی دواخانوں میں یا گھروں پر ہوتے ہیں لیکن مرنا ان کی قسمت میں سرکاری دواخانوں میں لکھا ہوتا ہے ۔ آخری خدمت کے علاوہ حیدرآبادی ، سرکاری دواخانوں سے بحالت مجبوری رجوع ہوتے ہیں جب ان کے پاس علاج کے لئے پیسے نہیں ہوتے ۔ سرکاری دواخانوں میں ایک جم غفیر رہتا ہے ۔ مریضوں کی لانبی قطاریں لگی ہوتی ہیں ۔ جو مریض اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکتے ہیں ان کو قطار میں ٹھہرے رہنا پڑتا ہے ، یہ اور بات ہے کہ مریض کی باری آنے تک وہ فریش ہوجاتا ہے ۔ بغیر قطار ان مریضوں کا معائنہ ہوتا ہے جنہیں اسٹریچر پر بحالت نزع لایا جاتا ہے ۔ قطار میں گھنٹے دو گھنٹے کھسکتے رہنے کے بعد ڈاکٹر کا دیدار نصیب ہوتا ہے ۔ شکایتیں اور تکالیف بیان کرنے کے بجائے ان کو عنوان سنانا پڑتا ہے ۔ "بخار" "اجابتیں" "دل میں درد" "شکر کی بیماری" "بلڈ پریشر" بعض مریض

اپنا دکھڑا سنانے لگتے ہیں تو انہیں ڈانٹ دیا جاتا ہے "ہمیں سب معلوم ہے ۔" اپنے آلے سے مریض کو چھوا اور اکثر اوقات بغیر چھوئے ہی نسخہ لکھ دیا ۔ تشفی نہ ہونے پر لب کشائی کی اجازت بھی نہیں، جیسے منصف نے فیصلہ لکھ دیا ۔ کچھ کہنے پر وارڈ بوائے کی مدد سے مریض کو ڈاکٹر کے سامنے سے ہٹا دیا جاتا ہے ۔ اپیل شام میں ڈاکٹر کے مطب پر فیس ادا کر کے کی جا سکتی ہے ۔ نسخہ حاصل ہونے کے بعد دواؤں کے لئے قطار میں ٹھہرنا پڑتا ہے ۔ انجکشن، گولیوں، شربت اور پٹی بندھوانے کے لئے مختلف قطاریں لگی ہوتی ہیں ۔ انجکشن، گولیوں اور شربت کا اسٹاک ختم ہو جاتا ہے لیکن قطار باقی رہتی ہے ۔ خوش قسمتی سے کبھی دوا ملتی ہے تو ایک یا دو گولیوں پر ٹرخا دیا جاتا ہے ۔ بقیہ دواؤں کے تعلق سے خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے ۔ تکلیف سے نجات پانا چاہتے ہیں تو انہیں بازار سے خریدنا پڑتا ہے ۔ سرکاری دواخانے سے ادھورا معائنہ، غلط تشخیص اور آدھی دوائیں حاصل کرنے میں سارا دن گذر جاتا ہے ۔ تھکن سے طبیعت نڈھال ہو جاتی ہے اور بیماری زور کرتی ہے ۔

آج کل کوئی کام سفارش اور رشوت کے بغیر نہیں ہوتا ۔ دواخانے میں مریض کا داخل ہونا بھی اسی کلیے کے زیر اثر ہے ۔ ویسے "نیکی" کی نیت سے چند مریضوں کو اس کلیے پر عمل کئے بغیر سرکاری دواخانوں میں شریک کر لیا جاتا ہے ۔ ایک مرتبہ ہم بھی ایک سرکاری دواخانے میں شریک رہے ۔ بڑے دواخانوں کی نشانی ہے کہ وہاں طب سیکھنے طالب علم آتے ہیں ۔ دن میں نوسکھ ڈاکٹر مریض کو تختہ، مشق بنائے ٹھوک بجا کر دیکھتے ہیں اور تمام رات مریض بیماری اور تختہ مشق کے رد عمل کی تکالیف سے کراہتا رہتا ہے ۔ ڈاکٹر احسان جتاتے ہیں کہ مریض کو مفت دیکھ رہے ہیں جبکہ حقیقتاً بخشش اور انعام کے نام پر مریضوں کو لوٹا جاتا ہے ۔ دوائیں خریدنی پڑتی ہیں ۔ معائنے بھی باہر کروانے پڑتے ہیں ۔ دواخانے میں کبھی ایکسرے فلم نہیں ہے تو کبھی معائنہ کرنے کے لیے درکار کیمیاء غائب ہے ۔ دواخانے سے روانگی کے وقت ہماری بیماری میں خاطر خواہ افاقہ نہ ہوا ۔ ڈاکٹر نے ڈسچارج کیا کہ ہم نے بہت دن پلنگ کو گھیرے رکھا ۔ اب ہمارا پلنگ کسی دوسرے مستحق مریض کو ملنا چاہئیے ۔ سرکاری دواخانے کے فرش پر ہمہ اقسام کی گندگی کی طرح مریض بھی پڑے ہوتے ہیں ۔ بعض اوقات دواخانہ رفیوجی کیمپ کا منظر پیش کرنے لگتا ہے ۔ دواخانے سے گھر آنے کے بعد ہم نے حساب کیا تو انکشاف ہوا کہ خانگی علاج کے تخمینے سے زائد پیسے سرکاری دواخانے میں خرچ ہوئے ۔ ڈاکٹر اور دوسرے اسٹاف کے ناز نخرے علحدہ برداشت کیے ۔ یار دوستوں نے سرکاری دواخانے میں شریک ہونے پر ہمیں پھنیچر مانا ۔ ایسے نقصان دہ سودے کو دیکھ کر ہم مزید بیمار ہوئے ۔

جیل اور سرکاری دواخانے دو ایسی جگہیں تھیں جہاں مفت میں جینے کا حق حاصل تھا بلکہ دواخانوں میں مفت مرنے کی سہولت بھی تھی لیکن چند دن قبل سرکاری دواخانوں میں غذا بند کر دی گئی ۔ دواؤں کا بھی کچھ حصہ ہی مفت ملے گا ۔ سنتے ہیں کہ اب سرکاری دواخانوں کو صنعتوں میں شمار کیا جائے گا ۔ ان صنعتوں میں صحت تیار کی جائے گی ۔ پیداوار، پر اکسائز ڈیوٹی اور سیلس ٹیکس عائد ہو گا ۔ ڈاکٹروں اور

دیگر ملازمین کو بونس بھی ملے گا۔ مریض اپنی مرمت کرواکر بل ادا کریں گے۔ ہمارے ایک دوست نے کہا "چلو اچھا ہوا۔ بیمار پڑنے کے بعد ہمیں سوچنا نہیں پڑے گا کہ مفت علاج کروائیں یا خانگی دواخانوں میں صحت کے دام لگائیں۔ ہر دو جگہ صحت خریدنا پڑے گی۔ جو اصحاب علاج کا بوجھ اٹھانے کی سکت نہیں رکھتے بہتر ہے کہ وہ بیمار ہی نہ پڑیں۔

سرکاری دواخانوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ملازمین وقتاً فوقتاً ہڑتال کرتے ہیں۔ مریض تکلیف کے باعث صبر کا دامن چھوڑ کر اونچی آواز میں کچھ کہہ دے تو ہڑتال کر دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اور نرس آپس میں لڑ پڑیں تو ہڑتال، مریض کے دوست احباب کچھ کہدیں تو سڑکوں پر ملازمین کا جلوس نکلتا ہے۔ تنخواہ بڑھانے اور دیگر الاونس کے لئے ہڑتال ہر کوئی کرتا ہے۔ اس بنیادی حق کا استفادہ دواخانے والے بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے ۱۹۷۷ء میں طویل ترین ۷۷ دن کی ہڑتال کی تھی جو ایک ریکارڈ ہے۔ سن کر تعجب ہوگا کہ ہمارے شہر میں موت کی وجوہات میں ایک اہم وجہہ دواخانوں میں ہڑتال بھی ہے۔ ہڑتال سے ملازمین اور مریض بیزار رہنے لگے ہیں۔ بات کو آگے بڑھانے اور ہڑتال پر جانے کے بجائے آپس میں ہاتا پائی کر کے معاملے کو ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے۔ مریض یا تیمارداروں کو غصہ آئے تو وہ ملازمین پر ہاتھ اٹھادیتے ہیں۔ ملازمین جواباً عرض ہے کہہ کر حسب مقدور پٹائی کرتے ہیں۔ یوں معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے۔

علاج معالجے کی تصویر کا دوسرا رخ خانگی دواخانے ہیں۔ طب آج کے دور میں مقدس پیشے کے حدود سے نکل کر بزنس بنتا جارہا ہے۔ بیمار صحت کا گاہک بن کر دواخانے جاتا ہے۔ بزنس کے اصول پر گاہک کی تشفی کا مکمل خیال رکھا جاتا ہے۔ خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔ صحت یاب ہونے کے بعد صحت کا بل پیش ہوتا ہے۔ جس میں ڈاکٹروں کے معائنے کی فیس، نرس کی خدمات کے دام، کمرے اور فرنیچر کا کرایہ دواؤں کی قیمت نل اور برقی کا بل، مختلف امتحانوں کا خرچ اور نہ جانے کیا کچھ شامل ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں صحت دواؤں کے استعمال سے زیادہ بل چکانے سے حاصل ہوتی ہے۔ اچھے بزنس مین کی طرح خانگی دواخانے نفع کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ خطرہ نہیں مول لیتے۔ انہیں امراض کا علاج کرتے ہیں جن میں شفا کی امید ہوتی ہے۔ قریب المختتم مریضوں کا علاج کر کے بدنامی اور بل پر جھگڑنا نہیں چاہتے۔

دواخانوں کی کارکردگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم وطنوں کو ہمارا مشورہ ہے کہ علاج کے لئے ہمیشہ ایک خطیر رقم جمع رکھیں۔ کہہ نہیں سکتے کہ کب بیمار پڑیں۔ ہم نے ایک ڈاکٹر کو کہتے سنا تھا۔ "گاہک کا بھروسہ نہیں، نہ جانے کب آئے"

جولائی ۔ ۱۹۸۶ء

انتخابات کا موسم

ہمارا ملک دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔ جمہوریت، مطلق العنانیت، سرمایہ داری نظام کے فائدے اور نقصانات دانشور جانیں، ہم جیسے عام شہری کے لئے جمہوریت کے معنی زندگی کے ہر قدم پر "انتخابات" کا انعقاد ہے تاکہ عوام کے لئے عوام کی جانب سے عوامی اقتدار قائم ہو۔

یوں تو سال کے بارہ مہینے کسی نہ کسی انجمن، اسوسی ایشن، یونین یا فورم کے انتخابات ہوتے رہتے ہیں لیکن جب سیاسی انتخابات ہوتے ہیں تو ایک دلچسپ اور پر خطر سماں بندھ جاتا ہے۔ انتخابی تقاریر اور نعرے گونجتے رہتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے انتخابات پر بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ سڑکوں پر جابجا پوسٹرس، بیانرس اور ہورڈنگس کے ذریعہ ووٹ کی اپیلیں کی جاتی ہیں۔ انتخابی نشانات سڑکوں پر لٹکنے لگتے ہیں۔ جابجا ورقیئے اور پمفلٹ تقسیم ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ سے انتخابی جلوس نکلتے ہیں۔ شہر کے در و دیوار سیاسی جماعتوں کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ اخبار اور رسائل انتخابی مواد سے بھرے ہوتے ہیں۔ انتخابی جھڑپوں سے ماحول خطرناک بن جاتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہم جمہوریت پسند لیکن انتخابات زدہ شہری ہیں۔

قدم قدم پر انتخابی دفتر کھل جاتے ہیں۔ بے روزگاروں کو روزگار مل جاتا ہے۔ مفت کھانا پینا مہیا کیا جاتا ہے۔ گھومنے پھرنے کے لئے سواریاں تیار رکھی جاتی ہیں۔ کارکن دن میں ووٹروں کی چھان بین کرتے ہیں۔ کون کہاں ہے؟ کون زندہ ہے، کون مر گیا، کس گھر میں کتنے ووٹ ہیں۔ ایک کارکن کو کتنے ووٹ ڈالنا ہے۔ رات میں دیواروں پر نعرے لکھنا اور پوسٹرس چپکانا جاری رہتا ہے۔ یہ کام وہ نوجوان انجام دیتے ہیں جو رائے دہی کا حق نہیں رکھتے۔ نوجوان جوش و خروش سے انتخابی مہم چلاتے ہیں۔ اپنے جلسے کو کامیاب بناتے اور مخالف امیدوار کے جلسے میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ کئی ووٹ ڈالتے ہیں اور وقت آنے پر بیلٹ باکس لے اڑتے ہیں۔

انتخابات کے دوران جہاں کہیں تھوڑی سی جگہ ملے وہاں جلسہ ہوتا ہے۔ ایک ہی مقام پر دو تین

انتخابی جلسے بھی ہوتے ہیں۔ امیدوار اپنے خرچ پر جلسے کرواتا اور پھول پہنتا ہے۔ مختلف لوگوں کی لکھی تقاریر از بر کر کے سناتا ہے۔ ہر امیدوار کے انداز جدا ہوتے ہیں۔ ملک کی سالمیت موضوع بحث ہوتی ہے۔ جمہوریت اور سیکولرزم پر حملے ہو رہے ہیں۔ مہنگائی اور قیمتیں، غربت اور بے روزگاری بڑھ رہی ہیں۔ بے روزگاروں اور نوجوانوں میں تشدد کے رجحان پر تشویش کا اظہار ہوتا ہے۔ افراط زر، بلیک مارکیٹنگ اور اسمگلنگ کے خلاف انتباہ دیا جاتا ہے۔ رشوت خوری اور چار سو بیسی پر لعنت بھیجی جاتی ہے۔ عورتوں اور کمزور طبقات پر مظالم کا واویلا ہوتا ہے۔ فسادات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جہیز نہ ملنے سے ہونے والی اموات پر آنسو بہائے جاتے ہیں۔ ہمہ اقسام کے ملکی اور انفرادی مسائل کا حل رائے دہندے کے "ووٹ" میں سمٹ جاتا ہے۔ اپنا ووٹ امیدوار کے حق میں استعمال کرنے پر تمام مسائل حل کر دینے کا یقین دلایا جاتا ہے بلکہ قسم کھائی جاتی ہے۔ ہم نے آج تک انتخابی تقاریر پر غور کرنا مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ یہ انتخابات جیتنے کے جذبے کے زیر اثر کی جاتی ہیں۔ ہم انہیں "انتخابی بڑ" کہتے ہیں۔

انتخابات کے موسم میں مکانات کا محفوظ رکھنا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ دیواروں پر نعرے اور اپیلیں لکھی جاتی ہیں۔ امیدواروں کی مسلسل دستک سے دروازوں کی چول چول ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ انتخابات کے بعد گھر کی دیواروں کی آہک پاشی اور دروازوں کی مرمت کروانی پڑتی ہے۔ آزادی کے بعد ہم نے اپنے گھر کی دو ایک انتخابات کے بعد آہک پاشی کروائی تھی۔ بعد میں انتخابات کی بہتات اور مہنگائی کے سبب ہم نے اپنے مکان کو جمہوریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ آج ہمارا مکان الکشن کمیشن کی طرح ہے۔ جہاں مختلف پارٹیاں رجسٹرڈ ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے اپنے مکان کو انتخابات سے محفوظ رکھنے کے لئے دیوار پر ایک نمایاں تختی بنوائی اور اس پر لکھا "جگہ برائے انتخابی نعرے اور سیاسی تک بندی۔" ان کا خیال تھا کہ جمہوریت میں دیواروں کو محفوظ رکھنے کا حق حاصل ہے لیکن صرف اس تختی کو چھوڑ کر ان کے گھر کی ساری دیواریں سیاسی جماعتوں کا مینی فیسٹو بن گئیں۔

انتخابات کا موسم وہ وقت ہوتا ہے جب لیڈر عوام کی خدمت کا ارادہ کرتے ہیں بلکہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کچھ کر گزرتے ہیں۔ انتخابات کے بعد لیڈر اپنی اور اپنے حواریوں کی خدمت میں مصروف رہتا ہے ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ ملک کی ترقی میں انتخابات اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اسی لئے انتخابات کا بار بار انعقاد ضروری ہے۔ انتخابات کے موسم میں سڑکیں درست کی جاتی ہیں۔ نل لگوائے جاتے ہیں۔ کنویں کھدوائے جاتے ہیں۔ روزگار فراہم کیا جاتا ہے۔ کرنٹ پہنچایا جاتا ہے۔ نئی بسیں اور ریل گاڑیاں چلائی جاتی ہیں۔ عوامی بھلائی کے کام انجام پاتے دیکھ کر ہم انتخابات کی آمد کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ ہمارے محلے میں موجود سرکاری نل میں انتخابات کے وقت ٹوٹی لگتی ہے اور پھر جیسے ہی انتخابات ختم ہوئے ٹوٹی بھی غائب ہو جاتی ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ جو امیدوار ٹوٹی نصب کروائے گا وہی بازی جیتے گا۔

انتخابات کے دوران لیڈر پدیاترا کرتے ہیں۔ یہی ایک موقع ہوتا ہے جب قائدین پیدل چلتے اور عوام سے ملاقات کرتے ہیں۔ انتخابات کے بعد انہیں شاید ہی کبھی پیدل چلنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ پدیاترا میں

امیدوار کی بے بسی کا عالم قابل دید ہوتا ہے ۔ امیدوار ، امید اور ناامیدی کی کیفیت سے دوچار ہر کس و ناکس کے آگے ہاتھ جوڑے چلے جارہے ہیں "بھائی صرف ایک ووٹ ۔ "ہر ووٹر اپنا مطالبہ پیش کر رہا ہے ۔ رائے دہندوں سے زیادہ مطالبات "میرے لڑکے کو ملازمت دلایئے" "بلدیہ کا لائسنس بنوا دیجئے" "گھر میں برقی کے کنکشن کے لئے سفارش کیجئے" بعض رائے دہندے سوال بھی کرتے ہیں ۔ "قیمتیں کم کیوں نہیں ہوئیں" "پچھلی مرتبہ ہم نے آپ کو ووٹ دیا تھا ہمیں کیا ملا سوائے اس کے کہ پھر سے آپ کو ووٹ دینے کا موقع ہاتھ آیا ہے ۔ "لیڈر ہر بات غور سے سن کر کئی نئے وعدے کرتے ہیں ۔ "ہم غریبی دور کریں گے" "سبز اور سفید انقلاب لے آئیں گے" "آپ ہمیں ووٹ دیجئے ۔ ہم آپ کو روٹی کپڑا اور مکان دیں گے" وغیرہ وغیرہ ۔

اردو ووٹوں کا بلینک چیک ہے جسے جھوٹی باتوں اور وعدوں پر بھنایا جاسکتا ہے ۔ انتخابات کے موسم میں اردو دیسی زبان بن جاتی ہے ۔ اردو زبان کی مٹھاس اور اس کی چاشنی کے گن گائے جاتے ہیں ۔ اردو اسکول کھولنے کا وعدہ کیا جاتا ہے ۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی قسم کھائی جاتی ہے ۔ لیڈر اپنی تقریروں میں بے موقع و محل اردو اشعار پڑھتے ہیں ۔ ایک قائد نے اردو زبان کے تعلق سے کہا تھا " اردو قومی زبان تو نہیں ہے لیکن قومی لباس شیروانی کی طرح ضروری ہے جس کا مخصوص موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے ۔"

انتخابات لڑنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے ۔ پچھلے انتخابات میں ہم نے ایک سیاسی پارٹی کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا ۔ کئی سوالات کا سامنا کرنا پڑا ۔ اہم سوال تھا "کیا آپ انتخابات کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں ؟" اب ہم انہیں کیا جواب دیتے ۔ عوامی خدمت کے صلہ میں ہم اپنا خرچ ہی مشکل سے برداشت کر پاتے ہیں ۔ دوسرے سوالات تھے کیا آپ انتخابی مہم کے لئے کارکنوں کا بھتہ ، کھانا پینا اور گھومنے پھرنے کے لئے سواریوں کا انتظام کر سکتے ہیں ؟ دنگا فساد کروا سکتے ہیں ؟ کتنے بوگس ووٹ ڈلوا سکتے ہیں ؟ وغیرہ وغیرہ ۔ سوالوں کو ہم نے غور سے سنا اور کہا "بھائی ہم صرف عوامی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں ۔ یہ تمام چیزیں ہم پسند کرتے ہیں اور نہ ہی کروا سکتے ہیں ۔ "ہمیں مخلصانہ مشورہ دیا گیا "تو پھر آپ یہ سب کچھ کرنے والے کے حق میں اپنا قیمتی ووٹ استعمال کیجئے ۔ شکریہ "

انتخابات کے موسم میں قائدین اور کارکنوں کی نیند اڑ جاتی ہے ، دن کا چین ہوا ہو جاتا ہے ۔ یہ بات قدرتی ہے لیکن ہم شہریوں کا بھی ناک میں دم رہتا ہے ، یہ لیڈروں کی مہربانی ہے ۔ رات دیر گئے انتخابی جلسوں سے چھٹی ملتی ہے ۔ آپ جلسے میں نہ جانا چاہیں تو کوئی بات نہیں جلسہ خود آپ کے پاس چلا آتا ہے ۔ امیدوار لاوڈ اسپیکر کے ذریعہ اپنی تقریر آپ کو اپنے گھر بٹھا کر سنا دیتا ہے ۔ ووٹ کی اپیل کرتا ہے ۔ دونوں کانوں میں روئی ٹھونس لیجئے پھر بھی آواز پیچھا نہیں چھوڑتی ۔ رات دیر گئے نیند آتی ہے ۔ چند لمحے ہی سو پاتے ہیں کہ سورج نکلنے اور مرغ بانگ دینے سے قبل لیڈر صاحب پدیاترا کرتے ہوئے دروازے پر موجود رہتے ہیں ۔ لیڈر سیاسی مسائل پر گفتگو کے بجائے آپ کی خیر خیریت دریافت کرتے ہیں اور ووٹ کی التجا کرنے

کے بعد چلے جاتے ہیں ۔ اب کارکنوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے جو پرچیاں اور پمفلٹ لیے رائے دہندوں کو ڈھونڈتے رہتے ہیں ۔ جوں توں کر کے بغیر ناشتہ دیر سے دفتر پہنچتے ہیں ۔ دفتر میں بھی سیاست، جمہوریت اور انتخابات پر گرما گرم بحث ہو رہی ہے ۔ ہر کوئی اپنی پارٹی کے حق میں تقریریں جھاڑ رہا ہے ۔ گھبرا کر کینٹین یا ہوٹل جائیے وہاں بھی "سیاسی گفتگو منع ہے" کی تختی کے نیچے بیٹھ کر انتخابات پر بات کی جاتی ہے ۔ بس میں بیٹھیے یا راشن کی کیو میں ٹھہریے ہر جگہ انتخابات کا چرچہ رہتا ہے ۔ "کیوں جناب آپ کا کیا خیال ہے ؟" اس سوال سے بحث شروع ہوتی ہے ۔ متعارف ہونے کی ضرورت بھی نہیں ۔ تمام دن انتخابات کو بھگتنے کے بعد شام گھر آنے پر پتہ چلتا ہے کہ بیگم سیاست پر بات کرنے پڑوس میں گئی ہیں ۔ آرام کرنا چاہتے ہیں تو کارکن انتخابی جلسوں میں بلانے کے لئے آنے لگتے ہیں اور پھر جلسے شروع ہو جاتے ہیں غرض ایسے لگتا ہے چہار طرف "الیکشن فیور" کی وبا پھیل گئی ہے ۔ ہمارے نزدیک انتخابات ، بخار سے زیادہ سرسام کی کیفیت ہے ۔

سیاسی پارٹیوں کی کمی نہیں ہے ۔ انتخابات کے قریب ٹکٹ کے مسئلے پر پھوٹ کے نتیجہ میں مزید کئی پارٹیاں بنتی ہیں ۔ دائیں اور بائیں بازو والی پارٹیاں ہونی چاہئیں لیکن ہمارے یہاں کئی پارٹیاں درمیانی نوعیت کی ہیں اور ایک پارٹی کی چند شاخیں حروف تہجی سے پہچانی جاتی ہیں ۔ ہر پارٹی کی پالیسی منفرد ہر امیدوار کے خیالات الگ الگ اور اپنی پارٹی سے جدا ہوتے ہیں ۔ سمجھ میں نہیں آتا کسے ووٹ دیں ۔ ہم ادھیڑ بن میں رہتے ہیں کہ ہمارا ووٹ کوئی اور استعمال کر جاتا ہے ۔ ہمارے ایک دوست نے اس الجھن کا حل یہ نکالا کہ وہ اس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں جس نے انہیں سب سے زیادہ کھلایا، پلایا اور پہنایا ہے ۔ وہ کہتے ہیں "امیدوار کی پالیسی اور خیالات امیدوار جانیں یہ ہماری اپنی پالیسی ہے" ۔

رائے دہی کے لئے نام ، ولدیت ، عمر اور جنس لکھی پرچیاں ہر امیدوار گھر بھجوا دیتا ہے ۔ شاذ و نادر صحیح معلومات درج ہوتی ہیں ۔ پچھلے انتخابات میں ہمارے والد محترم کا نام بدل دیا گیا تھا ۔ ایک اور مرتبہ ہماری جنس تبدیل کر کے پڑوس میں رہنے والے خان صاحب سے شادی بھی کروادی گئی تھی ۔ ووٹ ڈالنے کے لئے گھر سے باہر نکلتے ہی کوئی کارکن اپنی پارٹی کا بیاج سینے پر لگا جاتا ہے ۔ کچھ دور چلنے کے بعد دوسرا پھر تیسرا بیاج سینے پر چسپاں ہوتا ہے ۔ سینہ ہمہ اقسام کے بیاجس سے پر ہو جاتا ہے ۔ ہر پارٹی کا کارکن سواری پیش کرتا ہے ۔ پولنگ بوتھ تک رہنمائی کی جاتی ہے ۔ پولنگ بوتھ سے باہر نکلنے کے بعد کوئی پوچھتا نہیں کہ آپ نے کس پارٹی کے حق میں ووٹ دیا ہے ۔ اگر آپ کسی کارکن سے کہیں کہ ہم نے آپ کو اپنا قیمتی ووٹ دیا ہے ، وہ آپ کا شکریہ تک ادا کرنا نہیں چاہتا ۔ پچھلی مرتبہ پولنگ بوتھ سے باہر آنے پر ہماری ملاقات اس امیدوار سے ہوئی جس کو ہم نے ووٹ دیا تھا ۔ ہم نے احسان جتانے کے لئے کہا "ہم نے آپ کو ووٹ دیا ہے ۔" یہ سن کر امیدوار نے ایک شان بے نیازی سے کہا "جیت گیا تو شکریے کا بیان اخبار میں پڑھ لیجئے اور ہاں اب آئندہ انتخابات تک خدا حافظ ۔"

دسمبر ۱۹۸۴ء

ناکردہ گناہوں کی سزا

"ناکردہ گناہوں کی سزا" کسی علامتی افسانے یا جدید نظم کا عنوان نہیں ہے ۔ حقیقتاً یہ اس سزا کا نام ہے جو حیدرآبادی کرفیو کے دوران بغیر گناہ کئے بھگتے ہیں ۔ ہمارے شہر میں وقتاً فوقتاً کرفیو نافذ کیا جاتا ہے بلکہ ہر وقت کرفیو نافذ ہونے کا اندیشہ ہمارے سروں پر منڈلاتا رہتا ہے ۔ رات آزاد سو کر صبح کرفیو میں اٹھتے ہیں ۔ کبھی دفتر پہنچنے پر پتہ چلتا ہے کہ شہر میں کرفیو نافذ ہو چکا ہے ۔ بگڑے ہوئے حالات کو قابو میں لانے یا سدھرے ہوئے حالات کو قائم رکھنے کے لئے ہمارے شہر کے حکام کے پاس کرفیو ہی واحد علاج ہے ۔

کرفیو ، اردو شاعری میں رباعی کی طرح ہے ۔ رباعی میں سمندر کو کوزے میں بند کیا جاتا ہے ۔ اسی طرح کرفیو کے دوران سمندر جیسی شہری زندگی کی خانہ بندی کی جاتی ہے ۔ کرفیو کے دوران ہماری ملاقات پڑوسیوں سے ہوتی ہے ۔ کرفیو کے نفاذ سے قبل ہم ، پڑوسیوں کو جانتے تک نہ تھے ۔ اب ہم ان کی کمزوریوں اور خوبیوں سے واقف ہو چکے ہیں ۔ ہمارے خیال میں کرفیو ہی وہ وقت ہوتا ہے جب گھر کے تمام افراد یکجا ہوتے ہیں ۔ ہماری لڑکی کو "کرفیو کی چھٹیاں" پسند آتی ہیں ۔ وہ کہتی ہے "کرفیو میں اسکول نہیں ہوتا ۔ بھیا کا کالج بند رہتا ہے اور ممی ڈیڈی کو دفتر بھی نہیں جانا پڑتا ۔"

کرفیو ایک سزا ہی تو ہے ۔ کام کاج اور روٹی روزی پیدا کرنا چھوڑ کر چہار دیواری میں قید ہو جانا پڑتا ہے ۔ یہ سزا مختلف ایام کے لئے دی جاتی ہے ۔ ہمارے شہر میں فراخدلی سے کئی کئی دن مسلسل کرفیو نافذ رہتا ہے ۔ گھر میں موجود راشن اور ایندھن ختم ہو جاتا ہے ۔ فاقوں کی نوبت آجاتی ہے ۔ بچے دودھ کے لئے بلکنے لگتے ہیں ۔ مریضوں کے لئے دوائی نہیں ملتی ۔ بالائے ستم نل سے پانی نہیں آتا ۔ بجلی غائب رہتی ہے گھر کی حالت زار سے بیزار ہو کر باہر نکلنا چاہیں تو پولس کی گالی ، لاٹھی اور گولی استقبال کے لیے موجود رہتی ہے ۔ ایک صاحب دوران کرفیو پولس سے الجھ پڑے "صاحب چاول ختم ہو گئے ہیں ۔" جواب ملا "کرفیو ہے ۔" "چار دن سے کام پر نہیں گیا فاقہ ہو رہا ہے " پھر جواب ملا "کرفیو ہے ۔" صاحب موصوف نے زچ ہو کر کہا

" عجیب کرفیو ہے ۔ شہر کی حالت بہتر تو شہریوں کی حالت ابتر ہو رہی ہے " اس مرتبہ کرفیو کی خلاف ورزی کرنے کی پاداش میں انہیں گرفتار کر لیا گیا ۔ پولس والوں سے کچھ ہوتا نہ دیکھ کر طویل عرصے تک نافذ رہنے والے کرفیو کے مصائب و آلام سے نجات حاصل کرنے ، حیدر آبادی جب مالک حقیقی سے دعا مانگنا چاہتے ہیں تب بھی کرفیو ہمارے اور مالک حقیقی کے بیچ دیوار بن جاتا ہے ۔

حیدر آبادی کرفیو کی سزا میں جزاء کا پہلو نکال لیتے ہیں ۔ کرفیو کے دوران پریشان ہونے کے بجائے گلی اور کوچوں کے لوگ مل جل کر سیاست پر بحث و مباحثہ ، حالات حاضرہ پر تبصرے ، کھیل تماشے اور دعوتیں کرتے ہیں ۔ ایسی تقریبات میں پولس بھی شامل ہو جاتی ہے ۔ نیند سے بیدار ہوتے ہی اخبارات کے اطراف بحث کے لئے محفل جمتی ہے ۔ کوئی منہ میں برش لئے تو کوئی کوئلے سے منہہ کالا کیئے محفل میں آتا ہے کسی دروازے سے کوئی لنگی سنبھالے تو کوئی نائٹ گون پہنے محفل میں وارد ہوتا ہے ۔ تبصرے ہوتے ہیں آئندہ کے لئے پیش قیاسیاں ہوتی ہیں ۔ سرکاری اعداد و شمار ، پریس بلیٹن اور سیاسی قائدین کے بیانات پر کوئی یقین نہیں کرتا ۔ ہر ایک کا اپنا الگ خیال ہوتا ہے جو افواہوں کا باعث بنتا ہے ۔ کچھ دیر بعد ناشتے کے لئے محفل برخواست ہوتی ہے ۔ ناشتے کے بعد حسب ذوق چھوٹی چھوٹی انڈور محفلیں جمتی ہیں ۔ کہیں تاش تو کہیں کیرم کھیلا جا رہا ہے ۔ ایک طرف شطرنج تو دوسری طرف پچیسی بچھی ہے ۔ کہیں فلمی گانے تو کہیں غزلیں بج رہی ہیں ۔ کہیں سائنس تو کہیں فکشن پر بات ہو رہی ہے ۔ دوپہر میں انڈور محفلیں برخواست کی جاتی ہیں لوگ کھانے اور قیلولہ کے لئے اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں ۔ سہ پہر اوٹ ڈور اجتماع ہوتا ہے ۔ کبڈی ، کرکٹ یا فٹ بال کھیلا جاتا ہے جس میں پانچ سے لے کر پچپن سال تک کے حضرات حصہ لیتے ہیں ۔ رات میں مل کر پاٹ لک کھانے کی محفل سجاتے ہیں ۔ کھانے کے بعد حفاظتی انتظامات کو قطعیت دی جاتی ہے ۔ رات دیر گئے اکثر لوگ سونے چلے جاتے ہیں ۔ چند نوجوان محلے کی رکھوالی کرتے ہیں ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان تمام محفلوں میں ہندو مسلم پڑوسی سب ہی حصہ لیتے ہیں جبکہ کرفیو ہندو مسلم فساد کی وجہ سے نافذ کیا جاتا ہے ۔

دوران کرفیو مقامی اخباروں کی اہمیت اور قیمت بڑھ جاتی ہے ۔ اخبارات " گرم کیک " کی طرح ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں ۔ وہ حضرات جو عام دنوں میں اخبار کی طرف نظر نہیں ڈالتے ، دوران کرفیو اخبار کو مقدس کتاب کی طرح سطر اسطر اپڑھتے نظر آتے ہیں ۔ اخبار واقعات ، بیانات اور اپیلوں سے بھرا پڑا ہوتا ہے ۔ چہار دیواری میں مقید لوگ اخبار کی خبروں پر تبصرے کرتے ہیں ۔ انہیں اصلیت چھپانے کا ذمہ دار گردانتے ہیں ۔ ریڈیو کے تعلق سے بات مختلف ہوتی ہے ۔ مقامی ریڈیو کی وقعت نہیں رہتی ، جسے دیکھئے صبح میں " وائس آف امریکہ " اور شام میں " بی بی سی " سے خبریں اور تبصرے سن رہا ہے ۔ ان سے نشر ہونے والی خبروں کی صداقت مسلمہ سمجھی جاتی ہے ۔ تبصرے حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ شاید ہی ایک موقع ہوتا ہے جب ہمارے شہر کا نام ان اسٹیشنوں سے نشر ہوتا ہے ۔ سچ ہے دوسروں کی تخریب سے ہر کسی کو دلچسپی ہوتی ہے ۔

عام حالات ہی میں پولس کا رویہ ناقابل فہم ہوتا ہے ۔ کرفیو کے دوران پولس کے رویے سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے ۔ یوں سمجھئے کہ بغیر بھونکے کاٹنے لگتے ہیں ۔ شہریوں سے کوئی گن سن لینا نہیں چاہتے بس لاٹھی گھماتے رہتے ہیں ۔ ایک شخص کرفیو کے دوران سڑک پر نکل آیا ۔ پولس والے لاٹھیاں برسانے لگے ۔ وہ چیختا رہا" صاحب کچھ میری بھی سنیئے ۔" کوئی بھی پولس والا اس کی بات سننے کے لیے تیار نہ ہوا ۔ مسلسل لاٹھیاں گھماتے ہوئے "بھاگ ۔ جا بھاگ ۔ تیری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھاگ! " ہانکتے رہے ۔ مار کھا کر نڈھال شخص روتے ہوئے کہنے لگا" رحم کیجئے صاحب میری ماں مر گئی ہے ۔ رحم صاحب رحم! " پولس والوں نے اپنا اپنا ہاتھ روک لیا ۔ جمعیت کے انچارج نے ڈانٹ کر پوچھا" بہت افسوس ہوا لیکن کرفیو میں تیری ماں کیسے مری ؟ " مظلوم شخص نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا" میری ماں ضعیف تھی اور قدرتی موت مر گئی ۔ " یہ سن کر اسے واپس جانے کے لئے کہا گیا" یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی ۔ کرفیو میں بلوائیوں یا پولس والوں کے ہاتھ موت واقع ہوتی ہے ۔ بھاگ جا ۔ "

پولس کے ہاتھوں مرنے اور پٹنے کے علاوہ گرفتاری کا اندیشہ بھی لگا رہتا ہے ۔ معصوم شہریوں کو گرفتار کرنا پولس والوں کا سہ آتشہ نشہ ہوتا ہے ۔ گالی گلوج کی جاتی ہے ۔ مار اور پیٹا جاتا ہے ۔ پھر بھی تشفی نہ ہونے پر گرفتار کیا جاتا ہے ۔ اکثر گرفتاریوں میں کاغذ بچانے (بچاؤ یوجنا مہم کے تحت) کے لیے پرچہ چاک نہیں کیا جاتا ۔ ایک صاحب کو گرفتار کرکے پولس اسٹیشن لایا گیا ۔ الزام تھا کہ دوران کرفیو انہوں نے آگ لگانے کی کوشش کی ۔ انہوں نے صفائی پیش کی " حضور اگر میرا ارادہ آگ لگانے کا ہوتا تو یہ کام چوری چھپے کرتا ، پہلے سے پروگرام بنالیتا اور یوں آسانی سے رنگے ہاتھوں پکڑا نہ جاتا ۔ میں نے سگریٹ جلانے کے لئے تیلی جلائی تھی ۔ " ان سے سوال کیا گیا" مگر تمہارے پاس سے صرف ماچس برآمد ہوئی ہے " ۔ " جی سرکار ۔ سگریٹ کی ڈبیہ راستے میں مجھ سے لے لی گئی " انہوں نے اپنی بے گناہی کا ثبوت دیا ۔ " خیر جب آپ کو گرفتار کرلیا گیا ہے تو چھوڑنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے ۔ " یہ کہہ کر انہیں سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا گیا

ہم حیدرآبادی دعا گو ہیں کہ ناکردہ گناہوں کی سزا برداشت کرنے کے صلہ میں روز محشر کردہ گناہوں کی سزا میں تخفیف ہو ۔ آمین ۔

جولائی ۔ ۱۹۸۴ء

اور کرفیو اٹھ گیا

زندگی کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ چند سال قبل ہم حیدرآبادی عید و تہوار مل جل کر مناتے اور ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرتے تھے۔ خلوص و محبت سے سرشار دل گلے ملتے تھے۔ لیکن آج اسی شہر میں عید و تہوار کے نام سے اوسان خطا ہونے لگتے ہیں۔ فساد کے اندیشے سے دل بے قابو ہونے لگتا ہے۔ کرفیو کے نفاذ اور اس کی صعوبتوں کے خیال سے کلیجہ منہہ کو آتا ہے۔ موت آنکھوں کے سامنے ناچتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے برخلاف کرفیو برخواست ہوتے ہی حیدرآبادیوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ گلی کوچوں میں چہل پہل ہوتی ہے۔ بازار اور سڑکوں کی رونق لوٹ آتی ہے۔ عید کا سماں بندھ جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرتے اور آپس میں گلے ملتے ہیں۔

کیلنڈر دیکھ کر ایک ایک دن کے حساب سے عید کا انتظار کیا جاتا ہے جبکہ ٹی وی اور ریڈیو سنتے ہوئے گھنٹوں کے حساب سے کرفیو اٹھنے کا انتظار ہوتا ہے۔ صبح اور شام ریڈیو کے اطراف لوگ کان جوڑے خبریں سنتے اور تبصرے کرتے ہیں "کرفیو نافذ ہوکر پورے ایک سو گھنٹے ہوئے، سنچری کے باوجود کرفیو اٹھنے کا اعلان نہیں ہوا۔" حد ہو گئی کرفیو میں ڈھیل دیئے بغیر کچھ کم ڈیڑھ سو گھنٹے پورے ہوگئے۔ گینز بک آف ریکارڈس میں وقفے وقفے سے ہمارے شہر میں نافذ ہونے والے طویل کرفیو کو جگہ ملنی چاہیئے۔"

جب کرفیو اٹھنے کا اعلان ہوتا ہے تو ہر کوئی خوشی سے جھوم اٹھتا ہے چاہے وہ نوزائیدہ بچہ ہی کیوں نہ ہو۔ پچھلے دنوں کرفیو اٹھنے کے ساتھ ہمارے دو سالہ لڑکے نے ہمکتے اور تتلاتے ہوئے "ڈیڈی کرفو کھل گیا، کرفو کھل گیا" کہہ کر اچھل کود کرنے لگا۔ تب ہم نے جانا کہ آزادی کیا ہوتی ہے۔

عید پر دوست احباب سے ملنا موقع ہے، دستور ہے اور رسم دنیا بھی ہے لیکن کرفیو اٹھنے کے بعد عزیز و اقارب سے ملاقات کرنا، ان کی خیریت دریافت کرنا اور بقید حیات رہنے پر دلی مبارک باد پیش کرنا

انسانیت کا تقاضہ ہوتا ہے ۔ کرفیو اٹھتے ہی جسے دیکھئے عزیز و اقارب سے ملنے دوڑا چلا جارہا ہے ۔ ایک مرتبہ کرفیو اٹھنے کے بعد ہم نانی اماں کے پاس نہ پہنچ سکے تو انہوں نے خود باوجود ضعیفی و علالت ہمارے گھر پہنچ کر خیر خیریت دریافت کی اور کہا "میاں ہم پچھلے وقتوں کے لوگ ہیں ابھی تمہاری طرح ہمارا خون سفید نہیں ہوا ۔ " عید کے دن دوست احباب سے چند مخصوص سوالات کئے جاتے ہیں ۔ نماز کہاں پڑھی ، کون سا عطر لگایا ، کپڑے کہاں سے خریدے ، کہاں سلوائے ، سویاں کیسے خریدیں ۔ اسی طرح کرفیو اٹھنے کے بعد احباب سے مل کر ایک مخصوص قسم کی گفتگو کی جاتی ہے ۔ آپ کے محلہ میں فساد کیسا رہا ، اسکور کیا ہے ، کرفیو کے دوران اشیائے ماتحیاج کیسے حاصل کرتے تھے ، پولس نے زیادتی ، بہت زیادتی اور بے انتہا زیادتی کی ہوگی ، فسادات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے وغیرہ وغیرہ ۔ عید کے موقع پر ان دوست احباب کی یاد ستاتی ہے جو ہمارے درمیان نہیں رہے ۔ اسی طرح کرفیو اٹھ جانے کے بعد ہم حیدرآبادی ، ان عزیز و اقارب کی یاد میں آنسو بہاتے اور مغفرت کی دعا کرتے ہیں جو فساد کی نذر ہوئے ۔ عید کے دن تمام گلے شکوے بھول کر ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں ۔ دل کی کدورت دور کرتے ہیں ۔ کرفیو اٹھنے کے بعد کچھ ایسا ہی فعل دہرانے کی ناکام سعی کی جاتی ہے ۔

دوران کرفیو حیدرآبادی قید کردیئے جاتے ہیں ۔ نوجوان شہریوں کو پولس پکڑ لے جاتی ہے جبکہ دوسروں کو گھر کی چہار دیواری میں قید کردیا جاتا ہے ۔ کرفیو اٹھتے ہی گھروں میں قید ہوئے شہریوں کو رہائی مل جاتی ہے ۔ ایک صاحب آزادی ملنے کی خوشی میں سڑک پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر انگڑائی بھی لینے نہ پائے تھے کہ دہشت پھیلانے کے الزام میں دھرلئے گئے ۔ کرفیو اٹھنے کے بعد بھی گرفتاری کا خدشہ لگا رہتا ہے جس طرح کہ ہمارے شہر میں امن بحال ہونے کے بعد پھر سے فساد ہوتا ہے ۔

ہمارے شہر میں پست تعلیمی معیار کی ایک اہم وجہ کرفیو ہے ۔ اسکول اور کالجوں کی موسمی تعطیلات کی فہرست میں کرفیو کی تعطیلات بھی شامل ہوگئی ہیں ۔ کرفیو تعطیلات ختم ہونے کے بعد بچوں کو پھر سے اسکول بھیجنے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے ۔ منت ، سماجت ، خوشامد کرکے اور رشوت دے کر اسکول بھیجنے پر پتہ چلتا ہے کہ بچے کا تعلیمی معیار اتنا پست ہوچکا ہے کہ وہ اپنا نام تک صحیح نہیں لکھ پاتا ۔ مزید براں گالی گلوج کرنی سیکھ لی ہے اور ذہن فرقہ واریت کی گندگی سے متاثر ہوچکا ہے ۔

کرفیو ، جسمانی اور ذہنی اذیت میں مبتلا کرتا ہے ۔ جسمانی تکالیف سہہ جاتے ہیں لیکن ذہنی اذیت اپنا رنگ جماتی ہے ۔ کرفیو کے دوران بے یقینی کی کیفیت ، حالات سے پریشانی اور مستقبل کی فکر ایک سوال " اب کیا ہوگا " بن کر دماغ پر لاٹھی چارج کرتا رہتا ہے ۔ نتیجتاً سوچ کرفیو زدہ ہوجاتی ہے ۔ ہمارے ایک دوست نے بتلایا " کرفیو کے دوران میں اتنا اکھار ہتا تھا کہ میری بیوی کو سوت کے وجود پر شک بلکہ یقین ہو چلا تھا ، کیا ہی اچھا ہوتا کرفیو کے بجائے یہی بات سچ ہوجاتی ۔ " کچھ لوگ کرفیو سے اتنا متاثر ہوئے کہ کرفیو اٹھنے کے بعد شاعری کرنے اور افسانے لکھنے لگے ہیں ۔ کرفیو زدہ شعراء اور ادباء کی بہتات ، اخبارات اور رسائل کے " کرفیو نمبر " شائع کرنے کی محرک بن سکتی ہے ۔ لیکن جناب معاملہ واقعی سنگین ہے ۔ سنتے ہیں

چند شہری کپڑے پھاڑ کر سڑکوں پر پتھروں کو انسانیت کا درس بھی دینے لگے ہیں ۔

کرفیو سے شادیاں ملتوی ہو جاتی ہیں جو کرفیو اٹھنے کے بعد انجام دی جاتی ہیں ۔ ہمارے شہر میں شادی کے رقعوں پر ایک اہم اطلاع منسلک ہوتی ہے ۔ " حالات پر امن رہنے کی صورت میں شادی مقررہ تاریخ پر ہوگی ۔ بصورت دیگر کرفیو اٹھنے کے بعد انجام پائے گی ۔ " کرفیو اٹھتے ہی بغیر بارات اور بیانڈ باجہ دولھا ایسے جاتا ہے جیسے چوری کرنے جارہا ہو ۔ جہیز لیئے بنا دولھا، دولھن کو لے جانے میں خیریت سمجھتا ہے ۔ شادی کی خوشی سے زیادہ لوگوں کو شہر کے حالات میں دلچسپی رہتی ہے ۔ شادی کی رسومات کا خاطر خواہ اہتمام ہو نہیں سکتا ۔ ہمارے ایک دوست کو اپنی شادی کا آج بھی قلق ہے ۔ وہ کہتے ہیں " شادی کرفیو میں ڈھیل کے وقت ہوئی تھی جو صرف ایجاب و قبول تک محدود رہی ۔ کاش تمام رسومات کے بعد کرفیو نافذ ہوتا تو میں کرفیو میں توسیع کی دعا مانگتا ۔ "

کرفیو اٹھنے کے بعد دل میں کئی ارمان کروٹ لینے لگتے ہیں ۔ سڑکوں پر چہل قدمی کرنے ، ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پینے اور گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو کر سگریٹ پھونکنے کو دل چاہتا ہے ۔ خود کو اور ڈاکٹروں کو آزاد دیکھ کر بیمار ہونے کو جی مچلاتا ہے اور تو اور شکم سیر کھانے کو دل للچاتا ہے ۔ کرفیو کے دوران بھوک تو رہتی ہے لیکن کھانے کو نہیں ملتا ۔ کرفیو اٹھنے کے بعد ہم ایک دوست سے ملنے گئے ۔ انہیں دیکھا ۔ شیو بڑھا ہوا ، بال الجھے اور گال پچکے ہوئے اور چہرے کی ہڈیاں نمایاں ۔ دس دن کے کرفیو نے گویا انکی عمر عزیز کے دس سال بڑھا دیئے تھے ۔ دریافت کرنے پر انہوں نے بتلایا کہ قوم کی حالت کے بارے میں سوچتے ، سوچتے وہ اس حال کو پہنچے ہیں ۔ یہ سن کر ہمیں تعجب ہوا ۔ لوگ قوم کے غم میں لنچ و ڈنر اڑاتے اور اپنا وزن بڑھاتے ہیں ۔ بعد از تحقیق انکشاف ہوا کہ موصوف نے کرفیو کے دوران صرف دو مرتبہ کھانا کھایا تھا ۔

دوران کرفیو اخبارات ، قتل و غارت گری ، چھرا زنی ، پتھراؤ ، لاٹھی چارج ، فائرنگ ، پولس کی جانب سے گرفتاریوں اور زیادتیوں کے واقعات سے بھرے ہوتے ہیں ۔ سچ پوچھیئے تو ہمیں اخبارات سے ڈر لگتا ہے ۔ اخبار ہاتھ میں لیتے ہوئے دل دعا کرتا ہے " مولا میرے قتل کی اطلاع کل کے اخبار کی زینت نہ بنے ۔ " کرفیو اٹھنے کے بعد اخبارات مزید دلچسپ ہو جاتے ہیں ۔ مختلف قائدین اور سیاسی پارٹیوں میں نوک جھونک شروع ہوتی ہے " فساد اس قائد نے کروائے " " فرقہ وارایت کو اس پارٹی نے پروان چڑھایا ہے " " اگر الزامات ثابت ہو جائیں تو میں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلوں گا " " حکومت سے استعفیٰ کا مطالبہ " وغیرہ وغیرہ ۔ ایسے لگتا ہے مراد کے اطراف گدھ بیٹھے نوچ کھسوٹ کر رہے ہیں ۔

کرفیو اٹھنے کے بعد حیدرآبادی چند اہم کام انجام دیتے ہیں ۔ تھیلیاں اور ڈبے اٹھائے بازار کا رخ کرتے ہیں ، پولس چوکیوں اور عدالتوں کے چکر کاٹتے ہیں ، ضمانت دے کر عزیز و اقارب کو گھر لاتے ہیں ، زخمیوں کی عیادت کرنے دواخانے جاتے ہیں ، ڈیتھ سرٹیفکٹ اور امداد حاصل کرتے ہیں ۔ ان کے علاوہ سب سے اہم کام ، پھر سے کرفیو میں مقید ہونے کی تیاری کرنا بھی ہے ۔

اگست ۔ ۱۹۸۴ء

فرقہ وارانہ فسادات پر جانوروں کی کانفرنس

فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بجھانے کے لئے انسانوں نے اپنی تمام توجہ اور قابلیت کو جھونک دیا۔ حکومت کے ذمہ داروں نے لاٹھی چارج کیا، آنسو گیس شل برسائے، فائرنگ کی، مختلف اشخاص کو مختلف الزامات کے تحت گرفتار کیا۔ چند قائدین کو قیام امن کے لئے نظر بند کیا گیا۔ امن پسند شہریوں نے امن کمیٹیاں بنائیں۔ نوجوانوں نے شانتی سینائیں تشکیل دیں۔ دانشوروں اور قائدین نے اخبارات اور رسائل کے لئے بیانات دیئے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اپیلیں نشر کیں۔ فسادات کی وجوہات اور انسدادی تدابیر کے سلسلے میں گھروں پر بحث و مباحثہ سے لے کر کانفرنس اور سیمنار تک منعقد کئے گئے۔ عوامی اور عدالتی تحقیقات بھی ہوئیں لیکن تمام کوششوں کا نتیجہ صفر رہا۔ امن پھر بھی بحال نہ ہو سکا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار نہ رہ سکی۔ ایسے نازک موقع پر جانور "حق انسانیت" ادا کرنے آگے بڑھے۔

گھوڑے کی تحریک پر جانوروں نے جس میں خرگوش، لومڑی، گائے اور کبوتر شامل تھے فرقہ وارانہ فسادات پر ایک کانفرنس کا اہتمام کیا۔ گھوڑا عقل مند ہے۔ تدبر اور فراست میں یکتا ہونے کے ساتھ انسانوں کا دیرینہ رفیق بھی ہے۔ ان خوبیوں کے پیش نظر جناب گھوڑا کو بہ اتفاق آرا۔ کانفرنس کا کنوینر مقرر کیا گیا۔ انتظامات کو قطعیت دینے کے بعد کنوینر کانفرنس جناب گھوڑا نے اپنا ایک کلیدی نوٹ بعنوان "فرقہ وارانہ فسادات پر جانوروں کی کانفرنس" صحافت کے حوالے کیا۔ "حیدرآباد کے طویل اور بدترین فرقہ وارانہ فسادات پر تمام پرند، چرند اور درند گہری تشویش اور دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ تشدد چاہے جس نام سے کیا جائے قابل مذمت ہے۔ ہم جانوروں کو اپنے آپ سے زیادہ انسانوں سے تعلق خاطر رہا ہے۔ ہم انسانوں کی بربریت پر خاموش تماشائی بنے نہیں رہ سکتے۔ لہذا جانوروں نے فیصلہ کیا ہے کہ ورلڈ لائف ہال میں ایک کانفرنس منعقد کی جائے جس کی صدارت صدر جنگل شری شیرجی مہاراج کریں گے۔ حضرت انسان کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا ہے۔ حضرت انسان کے علاوہ ہم کسی اور کو

دعوت نہیں دیں گے۔ ہر جانور کا اخلاقی فرض ہو گا کہ وہ کانفرنس میں شریک رہے۔ کانفرنس کے فوری بعد صدر جنگل شری شیرجی مہاراج کی قیادت میں فساد سے متاثرہ محلوں میں جانوروں کا امن جلوس نکالا جائے گا اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس کانفرنس اور امن جلوس کے پیچھے کسی بڑی، علاقائی یا فرقہ وارانہ جماعت کار فرما نہیں ہے اور نہ ہی کسی "باہر کے ہاتھ" کی کارستانی ہے یہ بھی واضح رہے کہ کانفرنس اور جلوس کا محرک انسانوں کے داخلی امور میں مداخلت کا جذبہ بھی نہیں ہے۔ یہ بات انسانوں پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ کہ جانور تہذیب، مذہب اور علاقہ واریت کی سطح سے اگرچہ بہت نیچے ہیں مگر ہمارا مقصد حیات انسانوں کی خدمت ہے۔"

حکومت کی جانب سے جانوروں کو شہر میں کانفرنس کے انعقاد اور نہ ہی امن جلوس نکالنے کی اجازت دی گئی۔ کنوینر کانفرنس کے بیان کے بعد شہر میں آوارہ مویشیوں کو گرفتار کر کے بنجر دوڈی (جانوروں کی جیل) میں قید کیا جانے لگا۔ ان اقدامات کے ساتھ پریس نے کنوینر کانفرنس جناب گھوڑا پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

س جانوروں کی کانفرنس کے خلاف حکومت کے اقدامات پر آپ کا کیا خیال ہے؟

ج اقدامات حکومت کر رہی ہے اور آپ خیال ہمارا جاننا چاہتے ہیں۔ جہاں تک کانفرنس کا سوال ہے وہ شہر میں نہ سہی جنگل میں مقررہ دن ضرور منعقد ہو گی۔

س کیا آپ لوگ اسے وقار کا مسئلہ بنا رہے ہیں؟

ج جناب والا! عزت، شرافت، وقار، نیکی، بدی جیسے الفاظ ہم جانوروں میں رائج نہیں ہیں۔

س کیا آپ حکومت سے احتجاج کریں گے؟

ج احتجاج کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا اس لئے ہم خاموش رہیں گے۔

س چند جانوروں کی گرفتاری کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ج انہیں گرفتار کیا گیا وہ گرفتار ہوئے۔ اس میں کونسی نئی بات ہے جس پر ہم رائے زنی کریں؟

چند اور سوالات کئے گئے جن کے جوابات جناب گھوڑا گول کر گئے۔ دوسری صبح اخباروں نے مختلف سرخیاں لگا کر کنوینر کانفرنس کے ظاہر کردہ خیالات کو بدل دیا۔ کسی نے لکھا کہ گول مول جوابات دینا جانوروں کا شیوہ ہے۔ کسی نے اسے خاموش احتجاج بتلایا۔ ایک اخبار نے جانوروں پر ظلم کی سرخی لگائی پریس کی کارستانی پر جناب گھوڑا زیر لب مسکرا کر رہ گئے۔

مقررہ دن کانفرنس شہر سے دور ایک وسیع میدان میں منعقد کی گئی۔ وقت سے پہلے جوق در جوق جانور جمع ہونے لگے۔ ہاتھی صاحب اور مسٹر کتا تبادلہ خیال کرتے ہوئے میدان میں آئے۔ محترمہ گائے کی پیٹھ پر موسیو کوا اور بھینس بیگم پر بابو بگلا بیٹھ کر آئے۔ کانفرنس کے صدر شری شیرجی مہاراج کو جلوس کی شکل میں لایا گیا۔ کئی پرندے اڑتے ہوئے آئے اور پاس کے درختوں پر بیٹھ گئے۔ مگر مچھ اور مچھلیاں

میدان کے قریب موجود تالاب میں بیٹھ گئیں۔ نوجوان جانور اپنے ہاتھوں میں تختیاں تھامے ہوئے تھے جن پر مختلف نعرے درج تھے "تمام انسان بھائی بھائی ہیں" ۔ "انسانو! اپنا مقام پہچانو ۔" مقررہ وقت پر کنوینر کانفرنس جناب گھوڑا چٹان سے بنے شہ نشین پر نمودار ہوئے ۔ گلا صاف کیا اور کہا " میں تمام شرکائے کانفرنس کا استقبال کرتا ہوں ۔ سبھی جانتے ہیں کہ آج ہم انسانوں کی درندگی اور بربریت پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں ۔ میں شری شیرجی مہاراج سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ صدارت کے لئے شہ نشین پر تشریف لائیں ۔ معزز صدر کی رہبری کماری بکری کریں گی ۔ " کماری بکری صدر کے لئے راستہ بناتے ہوئے انہیں شہ نشین پر لے آئیں ۔ سامنے بکری اور پیچھے شیر ایک قابل دید منظر تھا ۔ معزز صدر کے نشست سنبھالنے کے بعد جناب گھوڑا پھر حاضرین سے مخاطب ہوئے " ہم نے حضرت انسان کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا تھا ۔ انہوں نے شرکت سے معذوری ظاہر کی ہے ۔ اپنے پیغام میں لکھا ہے کہ شرمندگی اور احساس ندامت کے باعث وہ کانفرنس میں شرکت سے معذور ہیں ۔ فسادات انسان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں اور حضرت انسان میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ بدنامی کا بوجھ اٹھائے کانفرنس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوسکیں ۔ وہ کانفرنس کی کامیابی سے زیادہ امن اور سکون کی بحالی کے لئے دعا گو ہیں ۔ اب میں جمیع حاضرین سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ مہلوکین کے سوگ میں دو منٹ کی خاموشی منائیں " ساری محفل میں سناٹا چھا گیا ۔ کبھی کبھار ابھرنے والی کھانسی اور کھنکھارنے کی آوازیں بھی سنائی نہیں دیں ۔ دو منٹ ختم ہونے کے بعد جناب گھوڑا نے خاموشی کو توڑا " اب محترم صدر سے گذارش ہے کہ وہ اپنی تقریر سے کانفرنس کا آغاز کریں ۔ "

زبردست تالیوں کے شور میں محترم صدر نے اپنی تقریر شروع کی " میں تمام حاضرین کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے اس مقدس کانفرنس کی صدارت کا اعزاز بخشا ۔ انسانوں کے فرقہ وارانہ فسادات پر ہر جانور دل برداشتہ ہے ۔ ایسی درندگی ہم درندوں نے بھی نہ دیکھی اور نہ سنی ۔ درندگی کے لئے میں ، شری چیتا ، شری بوربچہ اور شری ببر ساری دنیا میں بدنام ہیں ۔ ہماری درندگی کا ایک مقصد ہے ۔ درندے اپنے ہم جنسوں کا شکار نہیں کرتے لیکن انسان بلا کسی مقصد اور وجہ کے اپنے بھائیوں کا قتل و خون کرتا ہے ۔ انسان کی درندگی کی وجہ کیا ہے ؟ فسادات کیوں پھوٹ پڑتے ہیں ؟ ان پر کیسے قابو پایا جائے ؟ ان ہی سوالات پر غور کرنے کے لئے یہ کانفرنس منعقد کی گئی ہے ۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ اپنے زریں خیالات کا اظہار کریں ۔ "

شری شیرجی مہاراج کی تقریر ختم ہوئی ۔ وہ جھومتے ہوئے مسند صدارت پر بیٹھ گئے ۔ مس ہرنی اپنی جگہ سے اٹھیں اور شہ نشین پر پہنچ کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگیں " عوام کی اکثریت امن پسند ہوتی ہے ۔ ہر فرقہ اور ہر نسل میں مٹھی بھر شرپسند عناصر ہوتے ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر عوام کے جذبات کا استحصال کرتے ہیں ۔ مذہب ، علاقائیت ، زبان اور نسل کے نام پر فساد برپا کرتے ہیں ۔ ایسے افراد انسان نہیں ہوتے بلکہ انسانوں کے بھیس میں بھیڑیے اور درندے ہوتے ہیں ۔ میں تمام جانوروں کی جانب سے شرپسند عناصر

پر لعنت بھیجتی ہوں۔" اتنا کہہ کر مس ہرنی اپنی جگہ جا بیٹھیں۔ کامریڈ بھیڑیئے نے پھرتی دکھلائی، چھلانگ لگا کر شہ نشین پر پہنچے "ابھی مس ہرنی اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔ میں ان کے اس خیال سے متفق ہوں کہ عوام کی اکثریت امن پسند ہوتی ہے۔ ساتھ ہی میں ان کے اس جملہ پر کہ شر پسند عناصر انسانوں کے بھیس میں بھیڑیئے اور درندے ہوتے ہیں، سخت احتجاج کرتا ہوں۔ ہم جانور، انسانوں کی درندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی انسانوں کی درندگی کے لئے بطور استعارہ ہمیں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ معصوم بے گناہ انسانوں کو بلا کسی مقصد کے قتل کیا جاتا ہے۔ نام پوچھ کر زندگی ختم کی جاتی ہے۔ بھوکوں کے لئے چاول، بچوں کے لئے دودھ، بیماروں کے لئے دوا لانے گھر سے باہر نکلنا موت کا بہانہ بنتا ہے۔ پچھلے فسادات میں ایک شاعر کے گھر پہنچ کر اس کے خاندان کو ختم کیا گیا۔ ایک عبادت گاہ میں بچوں اور بوڑھوں کا قتل کیا گیا کمزور صنف عورت پر بھی قاتلانہ حملے کئے گئے۔ کیا ایسی درندگی کی مثال ہم جانوروں میں ملتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ بہتان کیسا؟" سوال کے بعد کامریڈ بھیڑیئے جذبات کی شدت سے کانپتے ہوئے اپنی جگہ جا بیٹھے۔

محفل میں کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ سبھی سوچ رہے تھے کہ مس ہرنی کو اپنے الفاظ واپس لینے کے لئے کہا جائے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس تحریک کو لئے اٹھتا، خود مس ہرنی اپنی جگہ کھڑے ہو کر گویا ہوئیں "میں اپنے کہے ہوئے الفاظ پر نادم ہوں۔ کامریڈ بھیڑیئے کے خیالات میں سچائی ہے۔" اتنا کہہ کر مس ہرنی بیٹھ گئیں۔

تقریر کے لئے محترمہ گائے اور بھائی گدھا ایک ساتھ اٹھے۔ بھائی گدھا اپنا جسم جھٹکتے رہ گئے جبکہ محترمہ گائے نے شہ نشین پر پہنچ کر تقریر شروع کردی "واقعی انسانی درندگی کی مثال نہیں ملتی۔ مذہب کے نام پر انسانوں نے درندگی کی ایک نئی تاریخ بنائی ہے۔ شکر ہے کہ جانوروں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا طاقت اور تشدد کے مظاہرے کے لئے نئے نئے جلوس نکالے جارہے ہیں۔ جلوس کے ساتھ ہر قسم کا ہتھیار ہوتا ہے۔ جلوسی مختلف دل آزار نعرے لگاتے ہیں۔ عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرتے اور موقع ملتے ہی فساد بپا کرتے ہیں۔ شادی کے جلوس بھی فسادات کا موجب بنتے ہیں۔ اشتعال انگیز تقاریر سے بھولے بھالے اور معصوم انسانوں کے دلوں میں تعصب اور نفرت کا بیج بوتے ہیں۔ اس درندگی، معاف فرمایئے انسانیت کا تاریک پہلو یہ ہے کہ میرے نام پر بھی اکثر فسادات ہوئے ہیں۔ میں اور میری بہن بھینس بیگم بلا لحاظ مذہب و ملت اپنے جگر کے ٹکڑوں کا حق تلف کر کے انسانوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ کبھی سوچتے بھی نہیں کہ ہمارا دودھ پینے والے کا مذہب کیا ہے۔ وہ کس علاقہ کا رہنے والا ہے۔ اس کی زبان کونسی ہے۔ اس کا رنگ کیا ہے۔ ہم جانور، رنگ، نسل اور ذات پات سے بے نیاز ہو کر بنی نوع انسان کی خدمت کرتے ہیں اور خود انسان، انسانیت کا دشمن بن کر اپنے ہی پیر پر کلہاڑی مار رہا ہے۔ جانے کب انسان کو عقل آئے گی" محترمہ گائے تقریر ختم کر کے شہ نشین سے اتریں کہ بھائی گدھا شہ نشین پر پہنچے اور کہنا شروع کیا "حضرت انسان بے وقوفیوں کی ذمہ داری میرے سر باندھتے ہیں۔ ہمیشہ مجھے بے وقوف، احمق اور ناسمجھ قرار دیتے ہیں لیکن کیا حضرت انسان بتلائیں گے کہ معصوم اور بے گناہ انسانوں کو قتل کرنا، کہاں کی دانشمندی ہے۔ انسان کے

پاگل پن اور جنون کا اندازہ لگائیے کہ وہ غلط شناخت کی بناء پر اپنے ہی فرقہ کا خون بہاتا ہے ۔ مزید برآں اخبار میں سرخی بھی لگی ہوتی ہے "غلط فہمی کی وجہ سے ہلاک ۔" کوئی بتلائے کہ دوسرے فرقے کے انسان کو قتل کرنا کونسی خوش فہمی ہے ۔ انتہا تو یہ ہے کہ حضرت انسان مذہب کے نام پر خون بہاتے ہیں ۔ کوئی بتلائے کہ کونسا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے ۔" بھائی گدھا کی تقریر ختم ہوئی ۔ چہار طرف سے "شیم ---- شیم ---- شیم ----" کی آوازیں بلند ہونے لگیں ۔ صدر کانفرنس شری شیرجی مہاراج کی درخواست پر حاضرین خاموش ہوئے ۔

پاس کے درخت سے برادر الو اڑتے ہوئے آئے اور صدر کی اجازت سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے "بھائی گدھے کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ میں بے وقوفیوں اور حماقتوں کی بابت مشہور کیا گیا ہوں ۔ چند محاوروں کے ذریعہ میرا رشتہ بے وقوفیوں سے اور بھی مضبوط کیا گیا ہے جیسے الو کا پٹھا، الو کی دم فاختہ ۔ انسان کی اس حماقت کو کیا نام دیا جائے جو فسادات کے دوران اپنے اوپر لاد لیتا ہے ۔ خوف اور دہشت کی فضاء میں سانس لیتا ہے ۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتا ہے ۔ سرشام شہر ویران ہوجاتا ہے ۔ سڑکوں پر جسے دیکھئے دل میں موت کا خوف لئے سہما ہوا حیران و پریشان ہر شخص کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا منزل مقصود کی جانب دوڑا چلا جاتا ہے ۔ عید و تہوار وبال جان ہوتے ہیں ۔ روایتی خوشی ہوا ہوچکی ہے ۔ عبادت گاہوں پر پولیس کا پہرہ لگا رہتا ہے ۔ ڈرے اور سہمے ہوئے پرملال چہرے عید کی مبارکباد دیتے ہیں ۔ شادی بیاہ کی خوشیاں ختم ہوچکی ہیں ۔ تین چار دن کی تقاریب گھٹ کر چند گھنٹوں کی خوشیاں بن چکی ہیں ۔ شادی کی بارات نکالنے کی اجازت نہیں ملتی اور جب ملتی ہے تو پولس ساتھ ہوتی ہے ۔ دولھے کو کوئی حسرت سے دیکھنے کے لئے نہیں رکتا ۔ لوگ بارات سے کترا کر نکل جاتے ہیں تو پولس براتیوں کو تیزی سے آگے بڑھالے جاتی ہے ۔" اتنا کہہ کر برادر الو آب دیدہ ہوگئے اور اڑ کر درخت پر جا بیٹھے ۔

مادام کبوتری اڑ کر آئیں اور کہنے لگیں " برادر الو نے جو حالات بیان کئے ہیں ان کو میری گنہگار آنکھوں نے بھی دیکھا ہے ۔ پرشکوہ بلند و بالا تاریخی عمارتوں سے میں نے بھی بے گناہ انسانوں کا خون بہتے ہوئے دیکھا ہے ۔ مرنے والا مرجاتا ہے لیکن اس کے بعد کئی کہانیاں جنم لیتی ہیں ۔ بچے یتیم اور ان کی مائیں بیوہ ہوجاتی ہیں ۔ گھروں میں ماتم ہوتا ہے ۔ ایسے مناظر ہم سے دیکھے نہیں جاتے اور ہم شرم سے اپنے ٹھکانوں میں دبک جاتے ہیں ۔" مادام کبوتری کی آنکھیں بھر آئیں ۔ وہ اپنے آنسو پونچھنے لگیں ۔ تمام جانور رنجیدہ ہوگئے ۔ مادام کبوتری پھر کہنے لگیں "میرے آباو اجداد نے اسی شہر میں گنگا جمنی تہذیب کا نظارہ کیا تھا ۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ بادشاہ وقت کی ایک آنکھ ہندو تھی تو دوسری مسلماں ۔ لوگ شیر و شکر کی طرح رہتے تھے ۔ ایک دوسرے کو عید و تہوار کی مبارک باد دیتے تھے ۔ ہائے وہ کیا زمانہ رہا ہوگا ۔" ماضی کو یاد کرتے ہوئے مادام کبوتری اپنی تقریر ختم کرکے درخت پر جا بیٹھیں ۔ مگر مچھ گارو بڑی مشکل سے پانی سے باہر آئے اور مختصر تقریر کی "زمانہ وہی رہتا ہے ۔ انسان بدل جاتے ہیں ۔ اس وقت کا انسان اپنی قدر اور اپنا مقام جانتا تھا لیکن آج انسان اپنی راہ سے بھٹک چکا ہے ۔ مفاد پرست اور ابن الوقت سیاسی قائدین کے ہتھکنڈوں کا

شکار ہو چکا ہے ، جو فسادات کروا کے ان پر دکھاوے کے آنسو بہاتے ہیں جسے انسانی الفاظ میں مگر مچھ کے آنسو کہا جاتا ہے "مگر مچھ کارو کی سانس پھولنے لگی ۔ وہ تیز قدم پھر سے پانی میں جا بیٹھے ۔

مسٹر کتا شہ نشین پر تشریف لائے اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے " فساد پھوٹ پڑنے کے بعد اس پر قابو پانا پولس کا کام ہے ۔ پولس کہاں تک کامیاب ہے ، اخباروں میں شائع ہونے والے بیانات سے ظاہر ہے ۔ " حالات قابو میں ہیں ۔ " ایک ہی دن میں دس بیس افراد ہلاک اور کئی افراد زخمی ہونے کے باوجود بھی حالات قابو میں رہتے ہیں ۔ " شرپسند عناصر کی نشاندہی ہو چکی ہے ۔ پولس جلد ہی انھیں ڈھونڈ نکالے گی " حالانکہ شرپسند عناصر اپنے بچاؤ کی تدبیر پہلے ہی سے اختیار کر چکے ہوتے ہیں ۔ " قانون کے ہاتھ لانبے ہیں " "صورت حال پر اعلیٰ سطح کے اجلاس میں غور ہوا وغیرہ وغیرہ " ۔ مسٹر کتا کے ان خیالات کو سن کر محفل میں قہقہے بلند ہونے لگے ۔ کسی گوشہ سے سیٹیوں کی آوازیں بھی آئیں ۔ کنوینر جناب گھوڑا نے مداخلت کی " امید ہے کہ حاضرین تہذیب کا دامن نہ چھوڑیں گے اور کانفرنس کا اختتام سنجیدگی سے ہوگا ۔ " ایک منچلے نوجوان جانور نے گرہ لگائی " یقیناً ایسا ہی ہوگا ہم انسان نہیں ہیں ۔ " اس برجستہ جملہ پر پھر قہقہے بلند ہوئے ۔ چند منٹ بعد محفل میں خاموشی چھائی تو مسٹر کتا نے اپنی تقریر جاری رکھی " بے گناہ افراد کی گرفتاریوں اور ان پر پولس مظالم کی شکایتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ۔ چند گوشوں سے پولس پر جانبداری کا الزام بھی لگایا جاتا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ اس الزام میں سچائی ہو ۔ پولس بھی اسی سماج کا ایک حصہ ہے جس میں فرقہ واراریت کا زہر سرایت کر چکا ہے ۔ پولس نہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہے اور نہ ہی ہم جانوروں کا دستہ ہے ۔ ویسے کئی مرتبہ میں پولس کی مدد کر چکا ہوں ۔ ہمیشہ میں نے اپنے فرائض ادا کرنے میں تندہی ، چالاکی اور غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے ۔ کاش پولس میں یہ تمام خوبیاں بہ درجہ اتم موجود رہتیں ۔ " مسٹر کتا افسوس کا اظہار کرتے ہوئے واپس اپنی جگہ پہنچ گئے ۔ شریمان بندر دو چھلانگوں میں شہ نشین پہنچے ۔ صدر سے علیک سلیک کی اور مصافحہ کرنے کے بعد تجویز پیش کی " میرے نزدیک ، فسادات کے انسداد کا ایک ہی راستہ ہے ۔ انسانوں کے ذہن سے فرقہ واریت کے زہر کو نکال باہر کرنا ۔ انسانوں کو سوچنا اور سمجھنا چاہیئے کہ تمام انسان ایک جیسے اور آپس میں بھائی بھائی ہیں ۔ کوئی بھی مذہب تشدد کی تعلیم نہیں دیتا ۔ ہر مذہب انسان کی بھلائی چاہتا ہے ۔ " محفل میں زبردست تالیاں بجیں ۔ شری شیر جی مہاراج نے شریمان بندر کی پیٹھ تھپتھپائی ۔ ایک شان بے نیازی سے وہ اچھلتے کودتے نیچے اترے ۔

کنوینر کانفرنس جناب گھوڑا شہ نشین پر تشریف لائے اور فرمایا " آخر میں کاکا ہاتھی سے گذارش کروں گا کہ وہ قرارداد پیش کریں ۔ " کاکا ہاتھی متانت کے ساتھ شہ نشین پر آئے اور قرارداد پیش کی ۔ " ہم تمام جانور شہر میں وقفے وقفے سے ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات سے سخت نالاں ہیں اور ہم خالق کائنات سے دعا گو ہیں کہ جس کے نام پر فساد کیا جاتا ہے وہی اشرف المخلوقات کو نیک ہدایت دے " ۔ چہار طرف سے آمین ۔ ثمہ آمین کے نعروں میں اس دعائیہ قرارداد کو متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا ۔ صدر اور کنوینر کانفرنس کے دستخط ہونے کے بعد قرارداد کو پریس کے حوالے کیا گیا ۔ میاں خرگوش نے شکریہ ادا کیا ، " میں

تمام شرکائے کانفرنس بشمول صدر کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ آپ نے اپنی مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر کانفرنس کو کامیاب بنایا"۔

آخر میں مسز بلبل اور ان کی ساتھیوں کی جانب سے پیش کردہ اس نظم پر کانفرنس اختتام کو پہنچی ۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

نومبر ۔ ۱۹۸۳ء

شہر باقی ہے، محبت کا نشاں باقی ہے
دلبری باقی ہے، دلداریٔ جاں باقی ہے

مخدوم
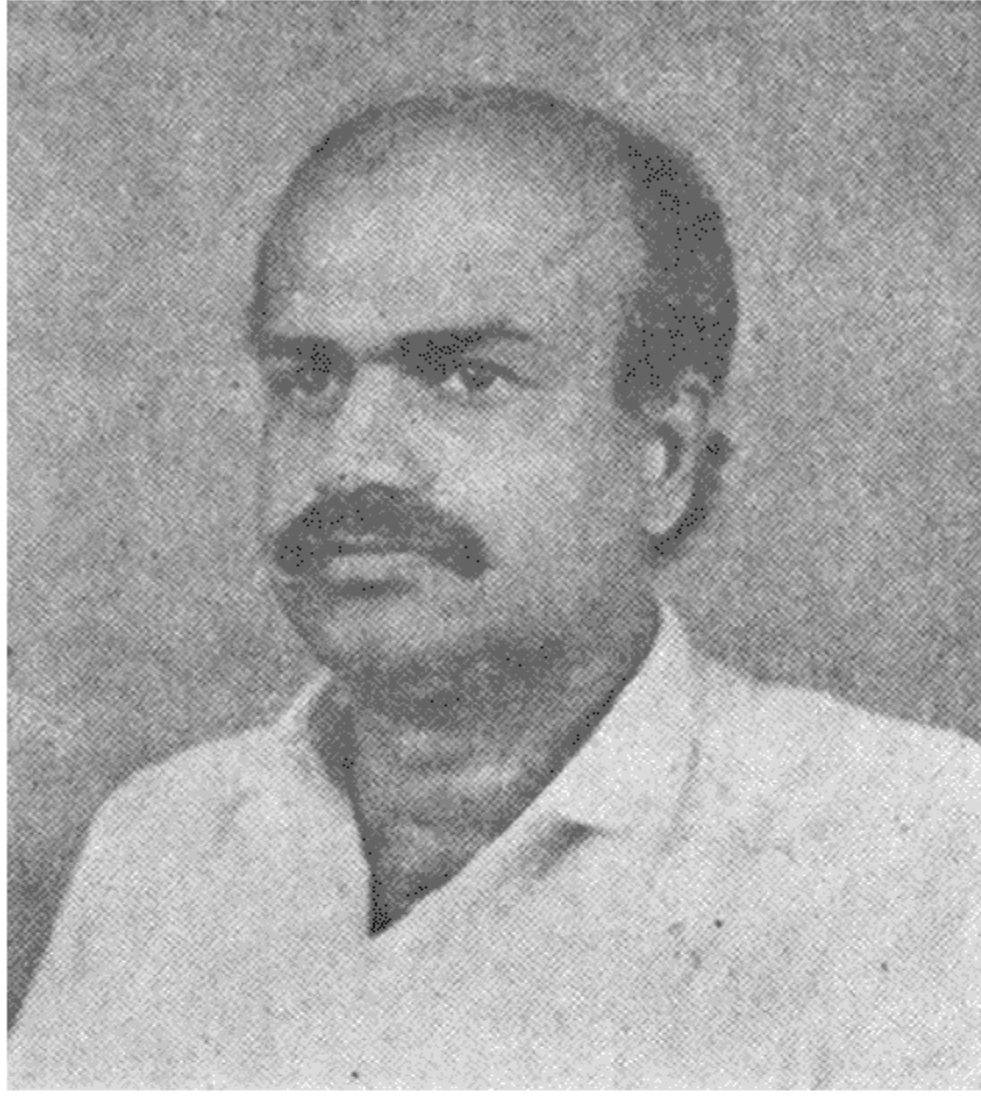
عَابد مُعز (خاندانی نام سید خواجہ مُعز الدین) ۲۵ جنوری ۱۹۵۵ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۷۹ء میں عثمانیہ میڈیکل کالج حیدرآباد سے ایم۔بی۔بی۔ایس اور ۱۹۸۵ء میں تغذیہ اور استحالی امراض میں پوسٹ گریجویشن کیا۔ چند برس حیدرآباد میں سیول اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۸۷ء میں سعودی عرب کا رُخ کیا جہاں وہ تادمِ تحریر منسٹری آف ہیلتھ، ریاض میں برسرِ خدمت ہیں۔

باقاعدگی سے لکھنے اور چھپنے کا سلسلہ ۱۹۸۱ء میں 'شگوفہ' سے شروع ہوا تب سے ہند و پاک کے مختلف اخبارات اور رسائل میں ان کے مزاحیہ مضامین شائع اور ڈائجسٹ ہوتے رہے ہیں' جن میں قابلِ ذکر 'شگوفہ' 'آج کل' 'کتاب نما' 'رابطہ' 'افکار' اور 'چہار سو' ہیں۔ جون ۱۹۸۳ء سے مارچ ۱۹۸۷ء تک ماہنامہ 'شگوفہ' میں 'مرا شہر لوگاں سوں معمور کر' عنوان کے تحت شہر حیدرآباد پر موضوعاتی مضامین کا سلسلہ جاری رہا جس کے منتخبہ چند مضامین زیرِ نظر کتاب میں شامل ہیں۔

ہند اور بیرونِ ہند کے مختلف ادبی اجتماعات میں مضامین سُنا چکے ہیں — زندہ دلانِ حیدرآباد سے وابستہ ہیں۔ سعودی عرب کے اُردو حلقوں کی جانی پہچانی اور مقبول شخصیت ہیں۔ سرزمینِ حجاز کی اَدبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں جنوری ۱۹۹۲ء سے ایڈیٹر اوورسیز کی حیثیت سے 'شگوفہ' کی ادارتی ذمّہ داریوں میں شامل ہیں۔ فکاہیہ تحریروں کے علاوہ طبّی مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں جو مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔